جاری کردہ
سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر

پروفیسر خورشید احمد

ادارہ ترجمان القرآن

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر : پروفیسر خورشید احمد　　　　نائب مدیر : مسلم سجاد

جلد ۱۲۶　　　اپریل ۱۹۹۹ ، ذو الحجہ ۱۴۱۹　　　عدد ۴

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ ' ملتان روڈ ' لاہور

فون : ۷۸۴۳۶۰۵

فیکس : ۷۸۳۲۱۹۴

E-mail: tarjuman@pol.com.pk

انتظامی امور

۵ - اے ذیلدار پارک ' اچھرہ ' لاہور

فون : ۷۵۸۷۹۹۱ - ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ ۱۵ روپے

زر سالانہ ۱۵۰ روپے

بھارت ۳۸۰ روپے

بنگلہ دیش ' ایران ۴۵۰ روپے

مشرق وسطیٰ ' یورپ

شرق بعید ' افریقہ ۶۵۰ روپے

امریکہ ' کینیڈا ' آسٹریلیا ۹۰۰ روپے

بنک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

تبدیلی کا طریقہ

جو شخص اپنے زمانے کے عام طرز خیال اور طرز عمل کو بدلنا چاہتا ہو اور لوگوں کی روش میں اصولی تغیر پیدا کرنے کا خواہش مند ہو' وہ مجبور ہے کہ ابتدا میں تخریبی تنقید پر زیادہ قوت صرف کرے اور تعمیری افکار کو آہستہ آہستہ بہ تدریج اور باقساط پیش کرے۔ تخریبی تنقید کے بغیر وہ الفت اور شیفتگی دور نہیں کی جا سکتی جو لوگوں کو رائج الوقت تخیلات اور طریقہ ہاے عمل سے طبعی طور پر ہوا کرتی ہے' اور جب تک یہ الفت دور نہ ہو' ان کے دماغ کسی نئی بنیاد پر تعمیر کا نقشہ سوچنے اور سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔ لہٰذا تخریب کے بغیر' یا ناکافی تخریب کے ساتھ' نئی تعمیر کا پورا نقشہ پیش کر دینا سراسر نادانی ہے۔

قوموں کی زندگی میں تغیر طفرہ [چھلانگ] کی شکل میں نہیں ہوتا کہ ایک حالت سے چھلانگ لگا کر دفعتاً دوسری حالت میں چلی جائیں' اور اگر سابق مقام سے اچکا دینے کے بعد ان کو پاؤں ٹکانے کے لیے دوسری جگہ نہ بتائی جائے تو ہوا میں معلق رہیں۔ اجتماعی تغیرات ہمیشہ تدریجی نشوونما کی صورت میں ہوا کرتے ہیں۔ اشخاص کی تنقیدیں اگر تجربات کی کسوٹی پر پوری اترتی ہیں تو قوم رفتہ رفتہ اپنے پرانے مسلک کو چھوڑتی جاتی ہے' اور نئے تعمیری افکار میں اگر طاقت ہوتی ہے تو آہستہ آہستہ وہ قوم کی زندگی میں اس طرح جذب ہوتے ہیں جیسے ایک شخص کے جسم میں غذا کے اجزا جذب ہوا کرتے ہیں۔

آئینی طور پر کام کرنے والے حضرات اس کے عادی ہوتے ہیں کہ کسی راستے پر پہلا قدم رکھنے سے پہلے پورے سفر کے لیے ایک مفصل اسکیم اور معین ٹائم ٹیبل ان کے سامنے موجود ہو۔ لیکن انقلابی طریق کار میں یہ کسی طرح ممکن نہیں۔ یہاں پہلے قدم کا رخ اور اس کا پیمانہ بھی اس وقت تک معین نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ اس امر کا پورا اندازہ نہ کرلیا جائے کہ قوم کا انقلابی رجحان کس حد تک پختہ ہو چکا ہے اور وہ اپنے نصب العین کے لیے جان لڑانے پر کہاں تک آمادہ ہے۔ لہٰذا ہر وہ شخص جو انقلابی طریق کار سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہو' اس داعی انقلاب کا مضحکہ اڑائے گا جو قوم میں انقلابی رجحان پیدا کرنے کے لیے پہلی آواز منہ سے نکالتے ہی انقلابی حرکت کے لیے ایک مفصل اسکیم بھی شائع کر دے (رسائل و مسائل' ترجمان القرآن' صفر ۱۳۵۸ھ' اپریل ۱۹۳۹ء' جلد ۱۴' عدد ۲' ص ۱۳۴-۱۳۷' ۱۴۲)۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

اعلان لاہور

لمحوں نے خطا کی ہے' صدیوں نے سزا پائی!

پروفیسر خورشید احمد

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ کو جس لاہور میں پاکستان کے قیام کو ملت اسلامیہ ہند نے اپنی منزل قرار دیا تھا اور ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ (۱۴ اگست ۱۹۴۷) کو جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل خاص سے قائداعظم کی رہنمائی میں برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی بیش بہا قربانیوں کے بعد قائم فرمایا تھا' ۲۱ فروری ۱۹۹۹ کو اسی لاہور میں' پاکستان کے نظریاتی اور سیاسی جسد پر "اعلان لاہور" کے روپ میں ایک ایسا خنجر پیوست کیا گیا ہے جس کی زد پاکستان کی شہ رگ یعنی کشمیر کے ساتھ ساتھ مملکت خداداد کی سیاسی آزادی' معاشی استحکام' عسکری قوت' نظریاتی تشخص اور تہذیبی وجود پر ہے۔ قرارداد پاکستان شیر بنگال فضل حق نے پیش کی تھی اور قائداعظم نے اسے امت مسلمہ سے منظور کرایا تھا۔ یہ برطانوی سامراج اور کانگریس کی ہندو قیادت کے خلاف اعلان جنگ اور مسلمانوں کی آزادی اور نظریاتی مستقبل کی ضامن تھی۔ ۱۴ اگست کو' جب بھارت کی اسلام دشمن قوتیں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل رہی تھیں' برطانوی سامراج کے نمائندے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے پروانہ آزادی ملت اسلامیہ پاکستان کے نمائندوں یعنی قائداعظم اور دستور ساز اسمبلی کے سپرد کیا تھا تو پاکستان کا پرچم پہلی بار قومی اسمبلی میں نہیں پورے ملک کی فضاؤں میں لہرانے لگا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اعلان لاہور نہ تو پاکستانی قوم کے عزائم کا اعلامیہ ہے اور نہ اسے پاکستانی عوام نے تسلیم کیا ہے۔ یہ اکھنڈ بھارت کی داعی بھارتیہ جنتا پارٹی کے بھارتی پردھان منتری اٹل بہاری واجپائی کا اعلامیہ ہے جس پر میاں نواز شریف نے بھی دستخط کر کے امریکہ اور بھارت کو خوش اور اپنی قوم کو مایوس

ہی نہیں مشتعل کیا ہے--- اور ملک و ملت کو نئے خطرات سے دوچار کر دیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنے ایمان' اپنے ملک کی آزادی اور اپنی قوم کی عزت کی خاطر حق کہنے اور اس کے لیے ہر اذیت اور تکلیف برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں۔ انھی مجاہدوں اور سرفروشوں نے اس گھناؤنی سازش کا بروقت پردہ چاک کر ڈالا جس کا اس ملک کو نشانہ بنایا جا رہا ہے اور قوم کو بانٹنے اور پاکستان اور جہاد کشمیر میں دوری اور بے اعتمادی پیدا کرنے کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اردو پریس نے قوم کی آواز کو بلند اور اس کے خدشات کو آشکارا کیا' خصوصیت سے نوائے وقت' پاکستان' خبریں' جسارت' امت' انصاف نے۔ سب سے بڑھ کر جموں و کشمیر آل پارٹیز حریت کانفرنس' جماعت اسلامی پاکستان' آزاد کشمیر کی تمام سیاسی جماعتوں اور پاکستان کی چند دوسری مذہبی جماعتوں' دانش وروں اور سابق فوجی قائدین نے اس کھیل کو ناکام بنا دیا جس کا مقصد صرف مسئلہ کشمیر کی تحلیل ہی نہیں بلکہ اس سرحد ہی کو منہدم کرنا تھا جو پاکستان کے آزاد سیاسی' نظریاتی اور معاشی وجود کی ضامن ہے اور جسے برعظیم کے مسلمانوں نے بڑی عظیم قربانیاں دے کر اپنے خون سے تعمیر کیا ہے۔

جس سازش کا اس وقت قوم مقابلہ کر رہی ہے وہ تیار تو واشنگٹن میں ہوئی ہے لیکن اسے اسٹیج کیا جا رہا ہے واہگہ اور لاہور میں۔ یہ تو اللہ ہی کے علم میں ہے اور غالباً تاریخ بھی اسے راز نہیں رہنے دے گی کہ پاکستان کی قیادت میں سے کون اس میں شعوری طور پر شریک ہے اور کون غیر شعوری طور پر' لیکن سازش اور اس کے خطرناک مضمرات سے انکار وہی کر سکتا ہے جس نے نہ دیکھنے اور نہ سمجھنے کی قسم کھالی ہو۔ اللہ کی رحمتیں ہوں ان بالغ نظر قائدین اور اہل قلم پر اور ان سرفروشوں پر جنھوں نے جان پر کھیل کر اس سازش کو طشت ازبام کیا اور ہزار بار شکر ہے اس رب کریم کا جس نے جھوٹ اور دھوکے کا پردہ صرف چند ہی دنوں میں خود بھارت کے ان قائدین اور ان کے ساتھیوں ہی کے ہاتھوں چاک کرا دیا جو بڑے معصومانہ اور دل نواز انداز میں فرما رہے تھے ؎

تم آؤ گلشنِ لاہور سے چمن بدوش
ہم آئیں صبحِ بنارس کی روشنی لے کر

پھر اس کے بعد یہ پوچھیں کہ کون دشمن ہے!

۲۰ فروری کو واجپائی صاحب نے لاہور میں فرمایا تھا: "وفاقی اخراجات میں کمی اور پاکستان سے بہتر تعلقات چاہتے ہیں" اور ۲۱ فروری کو دہلی پہنچتے ہی ارشاد فرمایا: "پاکستان کے وزیراعظم سے کہہ دیا ہے کہ کشمیر میں مداخلت اور راجوڑی میں قتل جیسے واقعات ناقابل برداشت ہیں۔ کشمیر میں بے قصور مردوں اور خواتین کو قتل کیا جا رہا ہے۔ اگر بے گناہوں کے قتل عام کا سلسلہ جاری رہا تو دونوں ملکوں کے تعلقات

معمول پر لانا مشکل ہو گا"۔ دو دن بعد مہاویر کیڈر کا افتتاح کرتے ہوئے واجپائی صاحب نے فرمایا: بھارت اب اپنی ایک انچ زمین بھی کسی کو نہیں دے گا اور وضاحت کی کہ کشمیر میں استصواب کے بارے میں کوئی بات نواز شریف صاحب سے نہیں کی اور ان کا بیان غلط ہے۔ بھارت کے نئے بجٹ میں دفاع کے نام پر جنگی بجٹ میں ۱۱ فی صد کا اضافہ کیا جو پہلے ہی ۵ کھرب روپے ہے اور جس میں گذشتہ سال ۸ فی صد کا اضافہ کیا گیا تھا جب کہ پاکستان میں دفاعی بجٹ میں سات سے نو فی صد کی کمی کی گئی ہے۔ پوکھران کے مقام پر پاکستانی سرحد کے ساتھ فضائیہ کی مشقیں پہلے اطلاع دیے بغیر کی گئیں جن میں ۱۷۰۰۰ ٹن گولہ بارود استعمال کیا گیا۔ یہ بھارت کی تاریخ کی سب سے بڑی مشقیں تھیں۔ پاکستان کو کشمیر میں "پراکسی وار" (Proxy War) ختم کرنے کی دھمکی دی۔ بھارت کے چیف آف اسٹاف نے نیوکلیر سدجارحیت کے باوجود روایتی جنگ کے امکان کا اعلان کیا اور کہا کہ اگر کشمیر میں پراکسی وار آگے بڑھتی ہے تو جنگ ممکن ہی نہیں ناگزیر ہے۔ بھارت کے وزیر داخلہ اور واجپائی صاحب کے دست راست ایڈوانی صاحب نے واہگہ کے عین اس مقام پر آکر جہاں واجپائی بس آئی تھی اکھنڈ بھارت کے منصوبے کا اعادہ اور کشمیر کے "اٹوٹ انگ" ہونے کی تکرار کے ساتھ تقسیم کے خط کو مٹا کر بھارت اور پاکستان کی فیڈریشن کے عزائم کا اعلان کیا--- اور اس طرح اعلان لاہور کی شکل میں جس کڑوی گولی پر شکر کی موٹی تہہ جمائی گئی تھی وہ اس اعلان پر دستخط کرنے والوں ہی کے ہاتھوں دھل گئی اور اصل سازش کا چہرہ پورے طور پر بے نقاب ہو گیا۔ بجز ان کے لیے' جن کا حال یہ ہے کہ ان کے دل ہیں مگر سمجھتے نہیں' آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں اور کان ہیں مگر سنتے نہیں (لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا ○ الاعراف ۷:۱۷۹)۔

پاکستان کی موجودہ حکومت اور خصوصیت سے وزیراعظم صاحب بھارت دوستی کے جس جنون میں مبتلا ہیں اور آنکھیں بند کر کے جس راستے پر چل نکلے ہیں وہ تباہی اور خودکشی کا راستہ ہے۔ ملک کو اس تباہی سے روکنا ہر محب وطن کی ذمہ داری ہے۔ حالات کے بے لاگ تجزیے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ میاں نواز شریف اور ان کے بھائی اور دست راست میاں شہباز شریف یہ سمجھتے ہیں کہ اقتدار میں رہنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان پانچ چیزوں کا اہتمام کریں:

۱۔ تمام دستوری اداروں' سیاسی قوتوں اور انتظامی مشینری کو مکمل طور پر اپنے تابع کرنا اور ایک ایسی مرکزیت کا قیام جس میں فیصلہ کرنے میں کوئی دوسرا شریک نہ ہو۔ مکمل اختیار صرف ان کو حاصل رہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ کوئی ادارہ اور کوئی حلقہ ایسا باقی نہ رہے جو ان کو چیلنج کر سکے۔

۲۔ حکومت کے نظام کو ذاتی وفاداری کی بنیاد پر مرتب و منظم کرنا اور اس کو اپنے اقتدار کو باقی رکھنے کا

راز سمجھنا۔

۳۔ امریکہ سے مکمل یک جہتی اور اس کے نئے عالمی نظام کا ایک جزو بننے اور اس کے نقشے کے مطابق کام کرنے میں اپنی نجات اور ترقی دیکھنا۔

۴۔ بھارت سے دوستی' ہر قیمت پر۔

۵۔ فوجی اخراجات میں کمی' فوج کی تخفیف اور اسے ایسے سول کاموں میں لگا دینا جس سے اس کا مفاد سیاسی قیادت کے مفاد کے تابع ہو جائے یا سیاسی قیادت کے ساتھ وہ بھی عوام کے اعتماد اور عزت سے محروم ہو جائے۔

یہ ہے ان کا اصل پانچ نکاتی منشور۔ ان کے درمیان بھی ایک ربط و تعلق ہے جو ایک سے دوسرے نکتے کے لیے تقویت کا باعث ہے۔ ان تمام رجحانات کو حکومت کے بیانات میں نہیں' پچھلے دو سال کی عملی پالیسیوں کے آئینے میں صاف دیکھا جا سکتا ہے۔

بھارت سے دوستی کے سلسلے میں ان کی بے چینی کا اظہار ۱۹۹۷ کے انتخابات کے لیے مسلم لیگ کے منشور میں پہلی مرتبہ ایک ایسے انداز میں ہوا جو اس سے پہلے کبھی مسلم لیگ یا کسی بھی دائیں بازو کی جماعت کا ہدف نہیں رہا۔ اس کا نوٹس صرف ہم نے ہی نہیں لیا' بلکہ خود نوائے وقت اپنے ادارتی کالموں میں اس پر گرفت کرنے پر مجبور ہوا۔ اقتدار میں آنے کے بعد پہلے گجرال صاحب سے اور پھر واجپائی صاحب سے جس طرح انھوں نے پینگیں بڑھائیں' اور بھارت کی کہہ مکرنیوں اور مکارانہ چالوں کے باوجود بڑھائیں' وہ ایک کھلی حقیقت ہے۔ قوم' سیاسی جماعتیں' دانش ور' صحافی' پارلیمنٹ' کابینہ' وزارت خارجہ' ان میں سے کسی کو بھی اعتماد میں لے کر کوئی سوچی سمجھی پالیسی نہیں بنائی گئی۔ محض اپنے ذاتی پسند و ناپسند کی بنیاد پر' ایک بہت ہی قریبی حلقے کی مدد سے جس کا علم' تجربہ' سیاسی سوجھ بوجھ اور قومی جواب دہی کے بارے میں کوئی شہادت موجود نہیں' وہ ملک و قوم کو اسی خاص سمت میں دھکیلنے پر مصر ہیں اور اگر قوم نے آگے بڑھ کر ان کا راستہ نہ روکا تو نہ معلوم وہ کس حادثے سے سب کو دوچار کر دیں۔ بلکہ آثار و قرائن تو یہ ہیں کہ اگلے چند ماہ ہی میں قوم کو فیصلہ کن صورت حال سے دوچار ہونا ہو گا۔

ستمبر ۱۹۹۹ سی ٹی بی ٹی کی آخری حد ہے۔ ساری تیاری اسی سمت میں ہے کہ اس وقت تک بھارت سے دوستی کا کوئی ڈراما رچا کر' کشمیر کے مسئلے کو تحلیل کر دیا جائے اور سی ٹی بی ٹی پر دستخط کر کے عملاً نیوکلیر پروگرام کو بھی رول بیک کرنے کا عمل شروع کر دیا جائے۔ اب تو صدر کلنٹن اور امریکی وزیر خارجہ میڈلین آل برائٹ نے برملا کہہ دیا ہے کہ ستمبر اور دسمبر ۱۹۹۸ میں پاکستان کے وزیراعظم نے اس کا وعدہ کر لیا ہے اور اب جو کچھ ہو رہا ہے وہ ایک خاص تدریج سے اس کی طرف پیش قدمی اور قوم کو رام کرنے کی

سعی ہے۔ بھارت سے بھی امریکہ الگ معاملات طے کر رہا ہے اور بھارت پاک دوستی کا ڈراما بھی امریکہ ہی کی ہدایت کاری میں اسٹیج کیا جا رہا ہے۔ میاں شہباز شریف کے امریکہ کے پھیرے بھی اسی سلسلے کی کڑی ہیں' اور بہت سے معاملات وزارت خارجہ' وفاقی نظام' کابینہ' پارلیمنٹ اور قوم سب سے بالا ہی بالا طے کیے جا رہے ہیں۔ واجپائی صاحب کی بس یاترا اس کا حصہ ہے' اعلان لاہور اسی کا شاخسانہ ہے' یہ اور بات ہے کہ اپنی فطرت سے مجبور ہو کر بھارت کی قیادت بچھو کی طرح ڈنک مارنے سے باز نہیں آتی!--- باقی تمام چیزیں ایک واضح نقشے کے مطابق وقوع پذیر ہو رہی ہیں۔

امریکہ اور بھارت سے دوستی بلکہ اس سلسلے میں وارفتگی کا یہ رویہ کہاں تک قومی مفاد اور ملک و ملت کی آزادی اور عزت کے مطابق ہے' اس پر کوئی بحث نہیں ہو رہی۔ کوئی دلیل اور کوئی شواہد ایسے پیش نہیں کیے جا رہے جن سے معلوم ہو سکے کہ امریکہ اور بھارت کے رویے میں کوئی بنیادی تبدیلی ہوئی ہے۔ ہم امریکہ سے دوستی کا خمیازہ ۱۹۶۵ سے بھگت رہے ہیں۔ آزمایش کے ہر لمحے میں امریکہ نے بے وفائی کی اور پاکستان کو صرف اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا لیکن معلوم حقائق کے باوجود' ہمارے حکمران اسی کی طرف دیکھتے ہیں اور بار بار اسی سوراخ سے ڈسے جانے کے لیے بے تاب ہیں۔

بھارت اور اس کی قیادتوں سے تو معاملہ اور بھی پرانا ہے۔ مسلمان برعظیم میں چودہ سو سال سے ہندو قیادت سے معاملہ کر رہے ہیں۔ انگریزوں کی آمد کے بعد ہندو' خاص طور پر برہمن قیادت نے انگریز سے سازباز کی اور مسلمانوں کی سیاسی قوت ہی نہیں عمومی مفادات تک کو تاراج کیا' جنگ آزادی میں ایسی ایسی غداریاں' بے وفائیاں اور دھوکے بازیاں کیں کہ مسلمانوں کو اپنا جداگانہ راستہ اختیار کرنا پڑا۔ قیام پاکستان سے لے کر آج تک کوئی موقع پاکستان کو نقصان پہنچانے کا ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس پورے پس منظر میں کون سی تبدیلی آئی ہے کہ مسلم لیگ کی قیادت کو بھارت سے دوستی کا دورہ پڑ گیا ہے۔ کوئی بات دلیل اور شواہد سے قوم کے سامنے نہیں لائی گئی۔ اس کے برعکس الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا میں پروپیگنڈے کا ایک طوفان برپا کر دیا گیا ہے کہ حکومت تو امن اور دوستی چاہتی ہے اور کچھ شدت پسند ہیں جو جنگ کی آگ بھڑکانا چاہتے ہیں اور گفت و شنید اور دوستانہ تعلقات کی مخالفت کر رہے ہیں۔ خود وزیراعظم صاحب ایسی اشتعال انگیز باتیں کر رہے ہیں کہ ۱۔ میں تحریک پاکستان کے بزرگوں سے تو مشورہ کر سکتا ہوں مگر ان سے مشورہ کیوں کروں جو پاکستان کے مخالف تھے' ۲۔ میری مخالفت اس لیے ہو رہی ہے کہ میں نے ایٹمی دھماکا کیا اور پاکستان کو ایٹمی قوت بنا دیا' ۳۔ میں ملک کو معاشی طور پر ترقی یافتہ بنانا چاہتا ہوں' موٹر وے بنا رہا ہوں' اور ان لوگوں کو ملک کی ترقی پسند نہیں۔

ان میں سے ہر بات جھوٹ کا پلندا اور عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف ہے۔ آپ

فرماتے ہیں کہ تحریک پاکستان کے بزرگوں سے مشورہ کر سکتا ہوں لیکن ذرا بتایئے تو کس بزرگ سے مشورہ کیا ہے؟ نوائے وقت نے صرف فروری اور مارچ ۹۹ میں ۲۰ سے زیادہ اداریے آپ کی بھارت دوستی کے خلاف لکھے ہیں۔ آپ نے اس کی کوئی بات مانی؟ مجید نظامی صاحب نے واجپائی کے لیے ایوان اقبال کا دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر مجبور کیا گیا تو مستعفی ہو جاؤں گا۔ آپ نے کس کا مشورہ مانا۔

آپ فرماتے ہیں کہ تحریک پاکستان کے مخالفین سے مشورہ نہیں کروں گا لیکن اے این پی جس کی قیادت نے آپ کو ناکوں چنے چبوا دیے ہیں اور جس کے آگے پیچھے آپ اور آپ کے حواری آج بھی پھر رہے ہیں، ان کو تحریک پاکستان کے مخالفین یا مویدین میں سے کس صف میں آپ رکھتے ہیں؟

آپ کا خطاب آپ کی بھارت نواز پالیسی کی سب سے بڑی مخالف جماعت اسلامی کی طرف ہے تو اس کی تحریک پاکستان کی مخالفت، کی اطلاع آپ کو کب ملی؟ ۱۹۸۸ سے ۱۹۹۳ تک آپ اس جماعت اور اس کے امیر محترم قاضی حسین احمد صاحب کے ساتھ ساتھ تھے۔ اس وقت یہ خبر آپ کو نہیں تھی۔ کیا یہ خبر آپ کو اس وقت ملی جب انھوں نے آپ پر گرفت کی اور آپ کا احتساب کیا؟ پھر کیا آپ کو علم نہیں کہ مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی نے دو قومی نظریے کی تشریح و توضیح اور کانگریس اور جمعیت علماے ہند کی متحدہ قومیت کے غبارے سے ہوا نکالنے کے لیے کیا خدمات انجام دی ہیں؟ اگر آپ نے خود برعظیم کے مسلمانوں کی تاریخ پڑھنے کی زحمت نہیں کی تو مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے مشہور مورخ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی کتاب Ulema in Politics اور قائداعظم کے رفیق شریف الدین پیرزادہ کی کتاب Evolution of Pakistan ہی دیکھ لی ہوتی، آپ کو پتا چل جاتا کہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی نے تحریک پاکستان کی مخالفت نہیں کی تھی بلکہ اس کی تقویت کا باعث تھی، گو کہ اس کا اپنا وجود اور طریق کار تھا۔ صوبہ سرحد کے استصواب کے موقع پر جب آپ کے ممدوح پاکستان کی مخالفت اور پختونستان کی بات کر رہے تھے، مولانا مودودی نے پاکستان کے حق میں ووٹ دینے کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن آپ کو حقائق سے کیا واسطہ؟ جماعت اسلامی پاکستان میں تو ہزاروں افراد ایسے ہیں جنھوں نے تحریک پاکستان میں عملاً حصہ لیا تھا اور قربانیاں دی تھیں اور خود راقم کو یہ سعادت حاصل رہی ہے لیکن اگر خود آپ سے سوال کر لیا جائے کہ تحریک پاکستان تو بڑی چیز ہے، آپ نے تو اپنے سیاسی سفر کا آغاز ایر مارشل اصغر خان کی تحریک استقلال اور آپ کے بھائی میاں شہباز شریف نے ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی سے کیا تھا اور جونیجو صاحب کی صدارت میں مسلم لیگ کا حصہ ہوتے ہوئے آپ نے مسلم لیگ کا تیا پانچا کرنے میں کیا کردار ادا کیا اور مسلم لیگ سے باہر ہوتے ہوئے قاضی حسین احمد صاحب نے آپ کو اور جونیجو صاحب کو مسلم لیگ میں ساتھ ساتھ چلنے کے لیے کیا کچھ کیا، تو آپ کے پاس "کیا کریں بات جہاں بات بنائے نہ بنے" کے سوا کیا جواب ہو گا؟

ایٹمی دھماکے کا کریڈٹ جتنا آپ لینا چاہیں لے لیں اور ہم نے بھی اسے تسلیم کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا اور بھٹو' ضیا الحق' فوج اور مایہ ناز سائنس دانوں کے ساتھ آپ کو بھی اس کا کریڈٹ دیا۔ لیکن یہ نہ بھول جائیں کہ ایٹمی دھماکے کا سب سے بھرپور مطالبہ جماعت اسلامی اور قاضی حسین احمد صاحب ہی نے کیا تھا اور ملک بھر میں وہ فضا بنا دی تھی کہ دھماکے کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہا تھا۔ یہی مطالبہ نوا ئے وقت اور ان تمام اخبارات اور قومی اداروں کا تھا جو آج بھارت دوستی پر گرفت کر رہے ہیں۔ بلکہ اگر آپ کو یاد ہو کہ خود آپ کو کلنٹن سے یہ کہنا پڑا کہ میں تو آپ کی بات ماننے کو تیار ہوں لیکن کیا کروں میں مجبور ہوں اور ملک کی فضا ایسی ہے کہ اگر میں دھماکا نہ کروں تو مجھے قوم اٹھا کر پھینک دے گی۔ آپ کی یہ پوری گفتگو امریکہ کے رسائل میں آپ کے اپنے الفاظ میں شائع ہو چکی ہے اور اس کا ٹیپ ریکارڈ وائٹ ہاؤس میں محفوظ ہے۔ پھر بھی آپ کی ہمت ہے کہ فرما رہے ہیں کہ جماعت اسلامی اور آپ کے دوسرے ناقد اس لیے آپ پر تنقید کر رہے ہیں کہ آپ نے پاکستان کو ایٹمی طاقت بنا دیا۔ ان کی تنقید تو اس پر ہے کہ ایٹمی طاقت ہونے کے باوجود آپ بھارت کے آگے گھٹنے ٹیک رہے ہیں' کشمیر پر کمزوری دکھا رہے ہیں اور امریکہ کے جال میں پھنس کر نیوکلیر قوت کو غیر موثر کرنے کا ذریعہ بن رہے ہیں۔ رہی بات معیشت کی' تو آپ ۱۵ سال سے حکمران ہیں۔ اس عرصے میں جو کچھ آپ نے معیشت کو دیا ہے اور جو کچھ آپ نے معیشت سے حاصل کیا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ ملک کو قرضوں کے ایک ایسے پہاڑ تلے آپ حضرات نے دبا دیا ہے کہ اب اس کی سیاسی اور نظریاتی آزادی بھی خطرے میں ہے۔ سڑکیں ضرور بنایئے لیکن غربت سے فاقہ کرنے اور خودکشی کرنے والے انسانوں سے روٹی کا آخری لقمہ نہ چھینیے۔ اس ملک کے حکمرانوں نے دونوں ہاتھوں سے ملک کو لوٹا ہے اور آپ سب بڑے بڑے ڈیفالٹرز میں سے ہیں۔ خود اتفاق گروپ ۱۰ ارب روپے کا ڈیفالٹر ہے۔ ابھی واپڈا کے چیئرمین کا بیان آیا ہے کہ آپ کی قومی اور صوبائی اسمبلی کے ۴۴ ارکان بجلی کی چوری کے مرتکب ہوئے ہیں۔ جن ہزاروں بھوت (ghost) اسکولوں کا پتا فوج نے چلایا ہے وہ آپ ہی کی وزارت اعلیٰ کے زمانے سے آپ ہی کے صوبے میں قومی وسائل لوٹ رہے تھے۔ تنقید کا یہ انداز اختیار کر کے آپ اپنے کس کس جرم پر پردہ ڈال سکتے ہیں۔ جو لوگ شیشے کے گھر میں رہتے ہیں انھیں دوسروں پر پتھر پھینکنے کے بارے میں محتاط رہنا چاہیے ؎

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

گفت و شنید' ڈپلومیسی کا ایک اہم طریقہ ہے اور اس سے نہ کسی نے انکار کیا ہے اور نہ انکار کا سوال

ہے۔ دنیا کے تمام ہی ممالک سے دوستی ہماری خارجہ پالیسی کا حصہ ہونا چاہیے۔ اس سے کسی کو اختلاف نہیں۔ سارا اختلاف دوست اور دشمن میں تمیز نہ کرنے پر ہے۔ امن اور سلامتی تو سب کی خواہش ہے۔ لیکن امن اور سلامتی' انصاف اور عزت کے ساتھ مطلوب ہیں۔ ورنہ لوگ زندہ تو غلامی میں بھی رہ لیتے ہیں اور سکون کی ایک نوع تو قبرستان میں بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ بھارت سے دوستی اسی وقت ممکن ہے جب وہ پاکستان دشمنی کی روش کو ترک کرنے پر تیار ہو' ہمارے حقوق ادا کرنے کے لیے آمادہ ہو' کشمیر میں جو ظلم اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا ہوا ہے' اسے بند کرے اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق اہل کشمیر کو اپنا مستقبل طے کرنے کے لیے استصواب کا حق دینے کو تیار ہو۔ اگر بھارت کی قیادت کے ہاتھ ہمارے بھائیوں اور بہنوں کے خون میں رنگے ہوں تو اس سے مصافحہ اور معانقہ' غیرت کے منافی ہے۔ یہ بات محض جذبات کی نہیں ہے۔ عالمی سیاست کا ایک اصول ہے کہ جن مذاکرات کے پیچھے عزم اور قوت نہ ہو وہ خسارے کا سودا ہوتے ہیں۔ فریڈرک اعظم (Frederik the Great) کا یہ جملہ بین الاقوامی سیاست کی ہر مستند کتاب میں ضرب المثل کے طور پر دہرایا جاتا ہے:

Deplomacy without force is like music without instruments. (Penguin Dictionary of International Relations, Penguin Reference, 1998, p 129).

"طاقت کے بغیر سفارت کاری ایسے ہے جیسے آلات کے بغیر موسیقی"۔

ہمارے لیے سب سے زیادہ ناقابل فہم آپ کی عالمی سیاست کاری کا یہ شاہکار ہے کہ آپ نے پاکستان کو' ایٹمی قوت بننے کے بعد "اعلان لاہور" کے ذریعے' ۱۹۷۲ کے شملہ معاہدے کی پستی میں دھکیل دیا ہے' اس شملہ معاہدے کی' جو ۱۹۷۱ کی مشرقی پاکستان میں شکست' ۹۰ ہزار پاکستانی فوجیوں اور شہریوں کے بھارتی قیدی بن جانے' اور پاکستان کے ہزاروں مربع میل علاقے پر ان کے قبضے کی وجہ سے ہمیں مجبوراً کرنا پڑا تھا اور جس کو خود بھارت نے سیاچن کے ایک حصے پر قبضے کے ذریعے خلاف ورزی کر کے غیر موثر بنا دیا تھا' جس کے تحت ۲۷ سال کشمیر کے مسئلے اور دوسرے پاک بھارت مسائل کے حل میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی' جسے پیپلز پارٹی اور اے این پی کے سوا کسی دوسری جماعت بشمول مسلم لیگ نے ایک جائز اور معقول معاہدہ تسلیم نہیں کیا' جس کا کوئی ذکر آئی جے آئی اور خود مسلم لیگ نے اپنے منشور میں نہیں کیا بلکہ جس کے بارے میں خود آپ کے وزیر خارجہ نے عین ۲۱ فروری ۱۹۹۹ کے اپنے بیان میں کہا کہ وہ مسائل کے حل کے لیے کوئی مناسب ماڈل نہیں ہے۔ اعتراض آپ کے انداز گفت و شنید پر ہے' اس فریم ورک پر ہے جس میں آپ بات کرنا چاہتے ہیں' ان اہداف اور ترجیحات پر ہے جو پاکستان کی متفق علیہ کشمیر پالیسی اور بھارت پالیسی کو یک طرفہ تبدیل کر کے آپ نے طے کی ہیں اور جن میں دو ایسی فاش غلطیاں (blunders)

آپ نے کی ہیں، جن کی کوئی تلافی نہیں ہو سکتی یعنی:

۱۔ سی ٹی بی ٹی اور نیوکلیر پالیسی کو بھارت کے دستخطوں اور مسئلہ کشمیر کے منصفانہ حل سے بے تعلق (delink) کرنا۔

۲۔ بھارت سے تعلقات کو معمول پر لانے کو، جن میں تجارت، رسل و رسائل کی سہولت، ثقافتی تبادلے، کھیل کود میں تعاون، اراکین پارلیمنٹ کا تبادلہ وغیرہ شامل ہیں، کشمیر کے مسئلہ کے حل سے بے تعلق (delink) کرنا۔

۵۰ سال کا تجربہ گواہ ہے کہ بھارت یہی چاہتا تھا کہ ہم کشمیر کے مسئلے کو ان تمام امور سے بے تعلق کر دیں جب کہ ہمارا اصل زور (leverage) ہی یہ تھا اور ہے کہ پہلے کشمیر کے مسئلے کا حل نکلے، پھر دوستی اور معمول کے تعلقات ہو سکتے ہیں۔ اعلان لاہور آج تک کی پالیسی سے انحراف اور ایک رجعت قہقری (retrogressive step) ہے جسے پاکستانی قوم کبھی قبول نہیں کرے گی اور جس سے خود آپ کو جلد رجوع کرنا ہو گا۔ اس لیے کہ تنازعہ کشمیر پر واضح پیش رفت کے بغیر ان میں کسی معاملے میں بھی بھارت سے تعاون، پاکستان کے مفاد کے خلاف اور بھارت کی حکومت کے ایجنڈے پر عمل ہے۔

اس کے دو ایسے خطرناک نتائج ہیں جو پاکستان کے بنیادی (vital) مفاد کی ضد ہیں:

۱۔ کشمیر کی تحریک مزاحمت اور کشمیری عوام کو یہ پیغام ملے گا کہ پاکستان ان کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کے لیے تیار ہے اور ان کو بھارت کے رحم و کرم پر چھوڑ رہا ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ تحریک کمزور ہو گی بلکہ اہل کشمیر کو جو توقعات پاکستان سے ہیں وہ ختم ہو جائیں گی، جس سے نہ صرف یہ کہ ان میں مایوسی بڑھے گی بلکہ وہ اسے بے وفائی سمجھیں گے اور پاکستان سے الحاق کے جذبات سرد پڑ جائیں گے اور "تیسرے آپشن" کے مویدین کو تقویت ہو گی۔ اہل کشمیر بھارت کے ساتھ تو ہرگز نہیں رہیں گے لیکن حکومت پاکستان کی اس عاقبت نااندیشانہ پالیسی کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ پاکستان کے حامی نہیں رہیں گے اور آزاد ریاست کا نعرہ لگانے والوں کی جھولی میں گرنے پر مجبور ہوں گے--- جو خود امریکہ کے ایجنڈے کا حصہ ہے۔

۲۔ اس سے پاکستان میں آج تک کشمیر اور بھارت کے سلسلے میں جو قومی اتفاق رائے پایا جاتا ہے وہ تباہ ہو جائے گا۔ کشمیر ہی ایک ایسا ایشو تھا جس پر پوری قوم میں یک رنگی تھی۔ اب نواز حکومت کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے اس ایشو پر بھی قوم کو بانٹ دیا ہے۔ وزیراعظم صاحب اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ یہ صرف چند سرپھروں کا معاملہ ہے جو ان کے اس موقف کو چیلنج کر رہے ہیں۔ قوم کی عظیم اکثریت اور خود ان کی مسلم لیگ کے عام کارکن اور ووٹر اس معاملہ میں ان کے ساتھ نہیں

ہوں گے۔ وہ قوم کو اور خود مسلم لیگ کو بانٹنے کا ذریعہ بنیں گے۔

یہ دونوں نتائج ایسے خوفناک ہیں کہ حکومت کو ان سے بچنے کے لیے پاکستان کی آج تک کی اصولی پالیسی سے انحراف کا راستہ ترک کر دینا چاہیے۔

تشویش کی ایک بات دوستی کا وہ خام اور طفلانہ تصور ہے جس کا نمونہ پیش کیا جا رہا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ دشمنوں کے درمیان بھی بات چیت ہوتی ہے لیکن اس کے کچھ آداب اور حدود ہیں۔ گو اس مکروہ اور دھوکے پر مبنی خطرے کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے جس کا نمونہ شیوا جی نے اورنگ زیب اور مرہٹوں کی لڑائی میں مذاکرات کے نام پر کیا تھا' لیکن اگر ڈپلومیسی کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو مذاکرات کے آداب سامنے آتے ہیں۔ روس اور امریکہ میں بھی سرد جنگ کے دوران مذاکرات ہوئے۔ اسرائیل اور عربوں نے بھی الگ کمروں میں بیٹھ کر بات کرنے کے بعد بالمشافہ بات چیت بھی کی اور ایک اسٹیج پر سرد مہری کے ساتھ ہی سہی مصافحہ بھی کیا۔ یہی صورت' حال ہی میں کوسووا اور سربیا کے مذاکرات میں دیکھنے میں آئی۔ امریکہ اور چین جنھوں نے ایک دوسرے کو برسوں تسلیم نہیں کیا ان میں بھی مذاکرات ہوئے۔ لیکن مذاکرات ایک چیز ہے اور دشمن کے نمائندوں کا فاتحوں جیسا استقبال کرنا ایک دوسری چیز ہے۔

بھارت کا ریکارڈ تو یہ ہے کہ اس نے جنوری ۱۹۹۹ میں کشمیر میں اپنے مظالم میں نمایاں اضافہ کیا۔ بھارتی فوج کے چیف آف اسٹاف نے روایتی جنگ کی دھمکی دی۔ وزیر خارجہ نے ۲۰ فروری کے دورے سے صرف دو دن پہلے کشمیر کے اٹوٹ انگ ہونے کا اعلان کیا۔ کلکتہ کے ایڈن گارڈن میں ۲۰ فروری کو کرکٹ میچ کا آغاز "پیار تو ہونا ہی تھا" کے بینر کی آرایش سے ہوا لیکن جب بھارتی کھلاڑی آؤٹ ہونے لگے اور شکست کا خطرہ منڈلانے لگا تو کھیل کو تہ وبالا کر دیا گیا اور بالآخر پورا اسٹیڈیم خالی کروا کے کرکٹ کی تاریخ کا پہلا میچ ایسا ہوا' جس میں کوئی تماش بین نہیں تھا۔ جب واجپائی صاحب کی بس واہگہ پہنچی تو بھارت کی بارڈر سیکورٹی فورس کے میوزک کی دھن "ساڈے نال رہو گے تے عیش کرو گے" تھی۔

اس کے برعکس ہمارا حال یہ تھا کہ جیسے کسی فاتح کا استقبال کر رہے ہیں۔ گورنر ہاؤس میں دعوت کو کافی نہ سمجھا گیا بلکہ شاہی قلعے میں شاہانہ استقبال کا اہتمام بھی ضروری سمجھا گیا' اور وہ بھی خاص مغل بادشاہوں کے انداز کا۔ یہاں ہمارے کارندے میوزک کی جن دھنوں پر اپنی عقیدت نچھاور کر رہے تھے وہ تھیں: "آئے گا' آئے گا آنے والا" ' "گھر آیا میرا پردیسی" اور "جانے والے ٹھہرو ذرا رک جاؤ"۔ معلوم ہوتا ہے جیسے رکھ رکھاؤ' سفارتی آداب' قومی غیرت' تحریک کشمیر پر اثرات' کسی کا کوئی لحاظ اور کوئی حدود ہمارے رہنماؤں کے سامنے نہیں۔ پاکستان کے ایک لائق سابق سفارت کار جناب عبدالستار نے بہت صحیح

کہا ہے کہ بھارت سے تعلقات کے بارے میں رکھ رکھاؤ اور حدود کا لحاظ بہت ضروری ہے۔ نہ دوستی اور نہ دشمنی--- دونوں کے درمیان کا راستہ اختیار کرنا چاہیے، خصوصیت سے جب دشمنی کے پس منظر میں تعلقات کی استواری ملحوظ ہو۔ لیکن ہمارے حکمرانوں نے دوستی سے پہلے ہی، الفت ہی نہیں عشق و محبت کے سارے ارمان نکالنا شروع کر دیے۔ اس پر عوام میں نفرت کا لاوا نہ پھوٹ پڑے تو کیا ہو؟

اخبارات میں معتبر ذرائع سے یہ بات بھی شائع ہوئی ہے کہ ماہر سفارت کاروں اور خود وزارت خارجہ کا مشورہ یہ تھا کہ ملاقات میں گرم جوشی کا زیادہ اظہار نہ کیا جائے، شاہی قلعہ میں دعوت کا اہتمام نہ کیا جائے، کشمیر پر پہلے سے کوئی عندیہ حاصل کر لیا جائے لیکن وزیراعظم صاحب کو "بتوں سے فیض" کی نہ معلوم کیا کیا توقعات تھیں کہ کسی کی بات نہ مانی اور ایک ایسی صورت پیدا کر دی جس کو برداشت کرنا قومی مفاد اور ملی غیرت کے منافی تھا اور وہ ظاہر ہو کر رہا اور واجپائی صاحب کو بھی کہنا پڑا: "کچھ تو ہونا تھا!"

واجپائی صاحب کا دورہ اور اس کا ایجنڈا کہاں تک دہلی اور اسلام آباد کا ساختہ تھا اور کہاں تک واشنگٹن کا شعبدہ؟ یہ سوال بھی ذہنوں کو مسلسل پراگندا کیے ہوئے ہے۔ واقعات جس ترتیب سے رونما ہوئے ہیں ان پر اگر غور کیا جائے تو بہت سے دریچے کھل جاتے ہیں۔ اعلان لاہور کی جس طرح مغربی دنیا میں پذیرائی ہوئی ہے اور خصوصیت سے صدر کلنٹن اور امریکی وزارت خارجہ نے جس طرح اس کا خیر مقدم کیا ہے اور خود اعلان اور میمورنڈم میں "نیوکلیر روک تھام" کے معاملے کو جس طرح لیا گیا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ع

پر ہم کچھ ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے!

اس سلسلے میں اہل خبر کیا کہہ رہے ہیں اس پر تھوڑے سے توقف اور غور و خوض کی ضرورت ہے۔

بھارتی روزنامہ دی ایشین ایج (The Asian Age) نے اپنے ۱۰ مارچ ۹۹ کے اداریے میں صورت حال کا یہ تجزیہ کیا ہے:

معلوم ہوتا ہے کہ امریکی انتظامیہ بھارت اور پاکستان کے دو طرفہ تعلقات کا، ایجنڈے کی ہر شق کی جزئی تفصیلات تک کا انتظام کلی طور پر کر رہی ہے۔ امریکی ڈپٹی سیکرٹری ٹالبوٹ کے دورے کے بعد، وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کے لاہور جانے کو محض اتفاق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس اقدام پر واشنگٹن کی شاباش کچھ تکلیف دہ ہی تھی اور جن کو اب بھی شبہ ہو، ان کے لیے اسسٹنٹ سیکرٹری آف اسٹیٹ کارل انڈر فرتھ کا یہ اعلان کافی ہونا چاہیے کہ جون یا جولائی میں وزیراعظم نواز شریف کا دہلی جانا طے ہے۔ یہ ایسا دورہ ہے جس کا اعلان متعلقہ ممالک نے نہیں کیا ہے اور افسران کو نہیں

معلوم کہ دوسروں نے کیا منصوبہ بندی کی ہے۔ مسٹرانڈر فرتھ کا بیان واضح علامت ہے کہ تاریخیں اب دوسرے ہی طے کر رہے ہیں' ضروری نہیں کہ بھارت اور پاکستان طے کریں۔

بھارت کا ایک ماہنامہ افکار ملی اپنے اداریے میں اس طرف اشارہ کرتا ہے:

۲۰ فروری کو امرتسر سے واہگہ تک ۲۷ کلومیٹر لمبی بس یاترا نے وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کو اپنے درپردہ مقاصد میں پوری طرح کامیاب کیا ہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان بس سروس کا فیصلہ فروری ۹۸ میں دونوں وزرائے اعظم کی نیویارک میٹنگ میں ہی کر لیا گیا تھا۔ حالات کا باریک بینی سے مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے رہنما کا یہ سفر بیرونی و اندرونی دباؤ کا نتیجہ تھا۔ امریکہ کی ایک عرصے سے یہ کوشش تھی کہ دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات بہتر ہوں اور نیوکلیائی تجربات پر پابندی اپنی حتمی شکل اختیار کر لے۔ نیز تعلقات کی خوش گواری امریکہ کو کشمیر کے معاملے میں ثالثی کا موقع فراہم کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ ادھر بھارتی وزیراعظم نے پاکستان یاترا کا سگنل دیا اور ادھر ورلڈ بنک نے امریکی اشارے پر آندھرا پردیش کے بجلی پروجیکٹ کے لیے عرصہ سے رکی ۲۱۰ ملین ڈالر کی رقم کی منظوری دے دی۔ اسی طرح اس بات کا امکان بھی پیدا ہو گیا ہے کہ حکومت ہند کو ۱۷ بلین ڈالر کے قرضے کی بھی ہری جھنڈی دکھا دی جائے گی" (افکار ملی ' مارچ ۹۹' ص ۱۰)۔

بھارت کے ایک اور اہم جریدے فرنٹ لائن (Frontline) (۱۲ مارچ ۹۹' ص ۱۴) کا کالم نگار لکھتا ہے:

یہ ظاہر کرنا کہ جنوبی ایشیا میں امن کے لیے اقدام سے امریکہ کا کوئی تعلق نہیں' شان کا اظہار ہو سکتا ہے' حقیقت سے بالکل بعید ہے۔

یہ بھی قابل غور ہے کہ واجپائی صاحب کے دورہ لاہور کے دوران صرف پاکستان میں امریکہ کے سفیر ہی لاہور میں موجود نہ تھے بلکہ بھارت میں امریکہ کے موجودہ سفیر رچرڈ سیلاسٹے اور سابق سفیر فرینک وزنر بھی جنھوں نے حال ہی میں چارج دیا ہے' موجود تھے۔

سوال یہ ہے کہ امریکہ کا اصل ایجنڈا کیا ہے؟ یہ امریکہ کے نائب وزیر خارجہ ٹالبوٹ کے مضمون سے جو مشہور امریکی جریدے فارن افیرز کے مارچ اپریل ۱۹۹۹ میں شائع ہوا ہے' نیز لندن ٹائمز' نیویارک ٹائمز' واشنگٹن پوسٹ اور دوسرے جرائد اور اخبارات کے تبصروں کی روشنی میں واضح ہو جاتا ہے:

۱۔ امریکہ کا اصل ہدف علاقے کی دونوں طاقتوں' اور خصوصیت سے پاکستان' کے نیوکلیر پروگرام کو ختم کرانا ہے۔ اس کے لیے اس کا اصرار ہے کہ پہلے سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرو جس کی توثیق آج تک امریکہ' روس اور چین نے بھی نہیں کی ہے۔ پھر ایف ایم سی ٹی (FMCT) یعنی ایٹمی مواد کی افزودگی کو فی الفور روک دو' حالانکہ ابھی اس سلسلے میں معاہدے پر بات چیت ہی شروع ہوئی ہے اور ابتدائی امور پر بھی اتفاق

رائے نہیں ہوا۔ غالباً دو سال معاہدے کو حتمی شکل دینے میں لگیں گے لیکن مطالبہ ہے کہ یہ ممالک مزید افزودگی کو فوراً روک دیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنی تنصیبات اور تجربات کو معاینے کے لیے کھول دیں جس کے لیے امریکہ اور باقی چار نیوکلیر ملک تیار نہیں اور این پی ٹی کے تحت انھیں تحفظ حاصل ہے۔

بھارت کے بارے میں تو ایسے آثار ہیں کہ امریکہ critical minimum deterrance کا اصول تسلیم کرنے کو تیار ہے۔ بھارت اس کی تعریف کرنے کو تیار نہیں اور اسے مبہم رکھنا چاہتا ہے۔ پاکستان کو یہ اختیار بھی دینے کے لیے امریکہ ابھی تک آمادہ نہیں ہے۔

یہ چار نکاتی مطالبہ نیوکلیر پروگرام کو cap کرنے' پرانی حالت پر لوٹانے' ہتھیاروں کی ترسیل کے نظام (delivery system) کو کنٹرول کرنے اور بالآخر مغربی اقوام کے معائنے کے تابع کرنے پر آمادہ یا مجبور کرنا ہے۔

۲۔ پاک بھارت مذاکرات کا آغاز اور اس میں بھارت کے اس ایجنڈے پر عمل کہ کشمیر کے مسئلے کو الگ کر کے باقی امور پر بات چیت اور سمجھوتہ کیا جائے۔ حکمت عملی یہ ہے کہ شور مچائے بغیر ایک ایک میدان میں عملاً تعاون شروع کر دیا جائے تاکہ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہو جائے۔

۳۔ کشمیر کے معاملے میں کسی ایسے راستے کو نکالنا جس میں: (i) دونوں کی آن رہ جائے۔ (ii) پاکستان کو مزید علاقہ یا بہتر عسکری پوزیشن حاصل نہ ہو سکے۔ (iii) بھارت کچھ علاقہ چھوڑ دے مگر وہ پاکستان کے پاس نہ آئے تاکہ بھارت کی فوج موجودہ دلدل سے نکل آئے لیکن پاکستان کو کوئی برتری (advantage) نہ حاصل ہو سکے۔ (iv) کچھ علاقے پاکستان اور بھارت میں ضم ہو جائیں اور کچھ کو نیم خود مختاری مل جائے جو خواہ ان دونوں کے مشترک نگرانی کے نظام میں ہو' یا صرف بھارت کے' یا اقوام متحدہ کے۔

یعنی یہ کہ بھارت کمزور نہ ہو' پاکستان مضبوط نہ ہو' چین پر نگرانی یا دباؤ ڈالنے کی کوئی صورت پیدا ہو سکے اور بھارت جو پھنسا ہوا ہے اسے سہولت (relief) مل جائے۔

اس کی تفصیلات ابھی طے نہیں ہوئی ہیں یا ابھی کئی متوقع صورتوں (scenarios) پر غور ہو رہا ہے لیکن مشترکہ اہداف وہی ہیں جو بیان کیے گئے ہیں۔ پاکستان کو یہ سبق پڑھایا جا رہا ہے کہ قوت سے وہ کشمیر کو حاصل نہیں کر سکتا' تحریک مزاحمت کمزور ہو رہی ہے' پاکستان عملی مدد بند کرے ورنہ اسے دہشت گرد ریاست (terrorist state) قرار دے دیا جائے گا۔ کچھ علاقہ پاکستان کو مل جائے گا اور بھارت سے تنازعہ ختم ہو جائے گا جس کے نتیجے میں وسائل' معاشی ترقی کے لیے استعمال کیے جا سکیں گے۔

بھارت سے کہا جا رہا ہے کہ تم جو اربوں روپے کشمیر پر خرچ کر رہے ہو' وہ بچا لو گے۔ پاکستان کو کوئی فوقیت حاصل نہیں ہو سکے گی۔ کشمیری تمھارے ساتھ رہنے کو تیار نہیں لیکن اس ... خود مختاری میں

تمھارے زیر اثر رہیں گے۔

اس ساری کارروائی کا اصل مقصد علاقے میں امریکہ کے اثر و رسوخ کو بڑھانا اور چین کے خلاف بھارت کے تعاون سے نگرانی کا ایک نیا نظام وضع کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ واجپائی کے دورے پر چین نے تشویش کا اظہار کیا ہے۔

۴۔ اس پورے کھیل میں پاکستان پر دو طرح کا دباؤ مزید ڈالا جا رہا ہے۔ ایک معاشی دباؤ جو حکومتوں کی غلط معاشی پالیسی' کرپشن اور بے تدبیری کی وجہ سے خاصا گھمبیر ہو چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر بھارت سے دوستی اور کشمیر کی تقسیم کی کسی صورت کو قبول نہیں کرتے تو علاقائی تحریکیں ترقی کریں گی' ان کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اور خدانخواستہ پاکستان کو ایک نہیں ۴ یا ۵ ملکوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

یہ ہے امریکہ کا اصل ایجنڈا۔ ابھی بھارت نے بھی اسے مکمل طور پر قبول نہیں کیا ہے اور نہ پاکستان ہی نے کلی طور پر مانا ہے لیکن دونوں آہستہ آہستہ اس جال میں پھنستے چلے جا رہے ہیں۔

اس اسکیم کا اصل ہدف بھارت نہیں' پاکستان ہے۔ لیکن پاکستان کی قیادت کو اس کا کوئی احساس نہیں۔ پاکستان کے پاس جو اصل قوت (leverage) ہے یعنی نیوکلیر صلاحیت' وہ عملاً اس پر قدغن اور کنٹرول کو تسلیم کر چکی ہے اور اگر قومی سطح پر عوامی دباؤ رونما نہیں ہوتا تو جولائی سے ستمبر تک کے عرصے میں سی ٹی بی ٹی پر دستخطوں کا خطرہ ہے' جو اس جال میں پھنسنے کا پہلا قدم ہو گا۔ اگر پاکستان اس دباؤ کا مقابلہ کر لیتا ہے تو ستمبر کے بعد سی ٹی بی ٹی غیر موثر ہو جائے گی اور نئے سرے سے مذاکرات شروع ہوں گے جن میں ہم اور پورا عالم اسلام اور تیسری دنیا کے ممالک ایک اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ اگر فاقہ کر کے بھی ملک اس دباؤ کا مقابلہ کرے تو پاکستان اور دوسرے ممالک ایک نیا کردار ادا کر سکیں گے۔ غالب امکان یہی ہے کہ خود امریکہ' روس اور چین بھی ستمبر کے آخر تک توثیق کو موخر کریں گے اور صرف اس وقت توثیق کریں گے جب باقی ۴۴ ممالک جن کی توثیق ضروری ہے' کر دیتے ہیں۔ اس کے لیے بڑے مضبوط اعصاب اور بے لچک مذاکرات کی ضرورت ہے جو قوم کی مکمل تائید کے بغیر ممکن نہیں۔

حکومت کی ایک بڑی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ اتنے اہم امور پر قومی پالیسی بنانے میں مشاورت کے اصول کو یکسر نظر انداز کیے ہوئے ہے۔ سی ٹی بی ٹی پر پارلیمنٹ میں بحث شروع ہوئی جو کسی نتیجے پر نہیں پہنچی۔ پریس اور عوامی سطح پر اس کی سخت مخالفت ہوئی۔ بحث کو ادھورا چھوڑ کر وزیراعظم صاحب نے صدر کلنٹن سے بات چیت کر ڈالی۔ جو گڑ کلھیا میں پھوڑا جا رہا ہے اس کا کسی کو علم نہیں۔ واجپائی سے مذاکرات کیے جا رہے ہیں' دعوے سے کہا جا رہا ہے کہ اس سال کے اندر معاملات طے ہو جائیں گے (یعنی وہی ستمبر والی بات!) لیکن نہ کابینہ میں بات ہوئی ہے' نہ پارلیمنٹ کو اعتماد میں لیا گیا ہے' نہ سیاسی اور دینی جماعتوں کی

قیادت سے بات چیت ہوئی ہے' نہ پریس میں اور الیکٹرانک میڈیا پر کوئی کھلی بحث ہے۔ یہ جمہوری نہیں خالص آمرانہ انداز حکومت ہے جو قوموں کو لے ڈوبتا ہے۔

یہ کیسا جمہوری اور دستوری نظام ہے کہ جمہوری اصولوں اور طور طریقوں کو یکسر نظرانداز کیا جا رہا ہے۔ جنرل ایوب اور جنرل ضیاء الحق فوجی حکمران تھے لیکن قومی سلامتی کے اہم مسائل پر سیاسی قیادت سے مشورہ کرتے تھے۔ جونیجو صاحب نے جنیوا معاہدے کے وقت نہ صرف تمام جماعتوں کی کانفرنس بلائی بلکہ پارلیمنٹ کا مشترکہ اجلاس بھی بلایا' لیکن نہ بے نظیر صاحبہ نے اور نہ میاں نواز شریف نے اہم قومی امور پر ملک کی سیاسی قوتوں اور پارلیمنٹ کے ایوانوں کو اعتماد میں لیا۔ ضرورت ہے کہ حکومت کو اہم بین الاقوامی معاہدوں کے سلسلے میں پارلیمنٹ کی توثیق کا دستوری طور پر پابند کیا جائے۔ ایسی دستوری پابندی کی عدم موجودگی میں عوامی دباؤ اور قومی رائے عامہ کو متحرک کرنے کا راستہ باقی رہ جاتا ہے۔ وہ افراد' ادارے اور جماعتیں مبارک باد کی مستحق ہیں جنھوں نے واجپائی کی لاہور یاترا کے موقع پر قومی جذبات کا اظہار کیا' خواہ انھیں کیسے ہی ظلم اور تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہو۔ جماعت اسلامی اور اس کی قیادت نے پوری قوم کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا اور ملک کو ایک بڑی آزمایش سے بچا لیا ورنہ خطرہ تھا کہ سی ٹی بی ٹی اور کشمیر کے معاملے میں مزید خرابی کی صورت پیدا ہوتی۔ اس عوامی احتجاج نے ایک وقتی بریک کا کام کیا ہے لیکن ضرورت رائے عامہ کو اتنا متحرک کرنے کی ہے کہ حکومت من مانی نہ کر سکے۔ اس کے لیے تمام محب وطن قوتوں اور اداروں کا تعاون ضروری ہے۔ جس طرح ۲۰-۲۱ فروری کے واقعات قومی کانفرنس نے ملت اسلامیہ پاکستان کے موقف کو زبان دی' اسی طرح درپیش خطرات اور آنے والے مراحل میں قوم کی صحیح رہنمائی اور حکومت کو غلط اقدامات سے روکنے کے لیے اشتراک اور تعاون کی ضرورت ہے۔ بات پرانی ہے مگر وقت کی ضرورت ہے ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے' تو عرصہ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

گناہ دشمن سے بھی زیادہ ڈرنے کی چیز ہے۔

دشمنوں کے مقابلے میں ہماری مدد اس لیے ہوتی ہے کہ وہ گنہگار ہیں۔

اگر یہ بات نہ ہوتی تو ہم ان کے مقابلہ میں ٹک نہیں سکتے تھے' اس لیے کہ نہ ہماری تعداد اتنی بڑی ہے' اور نہ تیاری ان کی جیسی ہے۔

اگر ہم گناہ میں اپنے دشمن کے برابر ہو گئے تو مادی طاقت میں وہ ہم سے بہت فائق ہیں۔

اگر اطاعت شعاری اور گناہوں سے پرہیز کی بنا پر ہمیں نصرت خداوندی کا استحقاق نہ حاصل ہوا تو اپنی طاقت سے ہم ان پر کبھی غالب نہیں آسکتے۔

تم لوگوں کی عداوت سے زیادہ اپنے گناہوں سے ڈرو۔ اپنی قدرت و طاقت سے زیادہ' اپنے گناہوں سے بچنے اور حفاظت کا اہتمام کرو۔

تم یہ ہرگز نہ سوچو کہ ہمارا دشمن ہم سے برا اور اللہ کا باغی ہے اس لیے اس کو ہم پر تسلط و غلبہ نہیں ہو سکتا' چاہے ہم گناہ کیوں نہ کریں۔

بہت سی قوموں پر ان کے گناہوں کے سبب ان میں سے بدترین لوگ مسلط کر دیے گئے۔

تم جس طرح دشمن کے مقابلے میں اللہ سے مدد طلب کرتے ہو' اپنے نفس کے مقابلے میں بھی اللہ کی مدد کے طالب ہو۔

(حضرت عمر بن عبدالعزیز کا مکتوب اپنے سپہ سالار منصور بن غالب کے نام)

خیر خواہ

عزم وارادہ، حکمت ودانائی

جو شخص بھی اسلام کے لیے کام کرنے اٹھے، اس کو چاہیے کہ مکہ مکرمہ کے ابتدائی دور کی تاریخ کا ضرور مطالعہ کرے۔ جو حالات اِس وقت پائے جاتے ہیں، اس سے بدرجہا زیادہ بدتر حالات اُس وقت پائے جاتے تھے، جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ کے حکم سے اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تھے۔ آج تو آپ کو سابقہ پیش آتا ہے پولیس اور فیڈرل پولیس اور اس کے بعد فوج سے یا ان غنڈوں سے جو پالتو درندوں کی طرح اسی غرض کے لیے پالے گئے ہیں کہ جو شخص یہاں کام کرنے اٹھے، اسے بھنبھوڑنے کے لیے دوڑیں۔ لیکن جب اسلام کی دعوت کا آغاز ہوا تو اس وقت سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر قبولِ اسلام کرنے والوں کے اپنے بھائی بند، اپنے سگے بھائی، اپنے سگے باپ، اپنے قریب ترین رشتے دار، اپنے قبیلے کے لوگ، سب ظلم وستم پر اتر آئے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت طلحہؓ کو ایک ساتھ باندھ دیا گیا۔ حضرت زبیرؓ کے ساتھ ظلم وستم کیا گیا۔ اسی طرح جن دوسرے لوگوں نے ابتدا میں اسلام قبول کیا ان کے پہلے دشمن، اور سخت ترین دشمن ان کے اپنے گھر کے لوگ تھے۔ ان کے گھر کے لوگوں نے ان کو اتنا ستایا کہ آخرکار ان میں سے کثیر تعداد کو اپنا ملک چھوڑ کر حبش کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ گھروں میں ان کا رہنا مشکل ہو گیا تھا، سڑکوں پر ان کا نکلنا مشکل ہو گیا تھا، ان کا بات کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ لیکن اللہ کا دین اس وقت بھی پھیل رہا تھا اور کوئی طاقت اللہ پر ایمان لانے والوں کے دلوں کو مرعوب نہیں کر سکی اور ان کا راستہ نہیں روک سکی۔ اگر اس تاریخ کو آپ پیشِ نظر رکھیں تو اس کے بعد اِس وقت جو رکاوٹیں پائی جاتی ہیں، ان رکاوٹوں سے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہم نے جب اس تحریک کا آغاز کیا تھا تو ہمیں اندازہ اس سے بہت زیادہ سخت رکاوٹوں کا تھا۔ ہمیں اندازہ تھا کہ ہمارا زمین پر جینا اور سانس لینا مشکل کر دیا جائے گا۔ اس وقت ہم نے اس تحریک کو اس ارادے کے ساتھ شروع کیا تھا کہ جان جس کی دی ہوئی ہے اس کی راہ میں چلی جائے، تو کوئی پروا نہیں۔ رزق دینے کا جس نے وعدہ کیا ہے جب تک وہ چاہے گا، رزق دے گا۔ خواہ وہ کسی راستے سے دے لیکن وہ رزق بہرحال دے گا۔ رزق چھیننے والے اگر اپنے آپ کو رزاق سمجھتے ہیں تو جھوٹے ہیں۔ ان کے

روکنے سے اللہ کا دیا ہوا رزق رکنے والا نہیں ہے۔ ہم اپنی جگہ اس سے بہت بدتر حالات کے لیے تیار ہو کر اٹھے تھے اور اللہ کا شکر ہے کہ جن بدتر حالات کا ہم نے اندازہ کیا تھا' ابھی تک وہ پیش نہیں آئے۔ اس لیے میں آپ سے صرف ایک بات کہوں گا کہ آپ یہ تدبیریں سوچنے کی فکر چھوڑیں کہ ان سیاسی حالات میں اور ان پابندیوں میں جو اس وقت پیش آ رہی ہیں' کیسے کام کیا جائے۔ یہ فکر چھوڑ کر آپ اپنے اس عزم کو تازہ کریں کہ اگر پہاڑ بھی ہمارے راستے میں آئے تو ہم اس کے اندر بھی سرنگ کھودیں گے۔ اس عزم کے ساتھ آپ اپنا کام کریں کہ جو طاقت بھی راستے میں حائل ہو' اس کے ہوتے ہوئے ہم اپنا کام کر کے رہیں گے۔

ضرورت باہر کے حالات سازگار ہونے کی نہیں ہے' ضرورت اندر کے عزم اور ایمان اور ارادے کے پختہ ہونے کی ہے۔ اگر وہ پختہ ہو تو باہر کے حالات خواہ کیسے ہی ہوں' آخر کار ان کے اندر سے آپ اپنا راستہ نکال ہی لیں گے۔ لیکن یہ بات اس سے پہلے بھی بارہا کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ اسلام کا کام کرنے والوں کے لیے یہ کوئی طریقہ نہیں ہے کہ وہ اندھا دھند کام کریں۔ ان کے لیے صحیح طریقہ یہ ہے کہ وہ حکمت کے ساتھ کام کریں اور عقل سے کام لیں۔ عقل سے کام لے کر دیکھیں کہ جو رکاوٹیں ہیں وہ کس نوعیت کی ہیں' اس کے بعد یہ دیکھیں کہ ان رکاوٹوں کے اندر سے ہم اپنا راستہ کیسے نکال سکتے ہیں۔

آپ کو یاد ہو گا کہ ۱۹۶۳ میں جب ہم نے اجتماع عام کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو اس وقت ہمارے لیے کیا کیا رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ جگہ ہم کو نہیں دی جا رہی تھی' بڑی مشکل سے ایک ایسی جگہ ملی جو ہر لحاظ سے اس اجتماع کے لیے غیر موزوں تھی۔ عین وقت پر لاؤڈ سپیکر ہمارے لیے ممنوع کر دیا گیا۔ ہمارے لیے نہ صرف پولیس بلکہ فوج کو تیار رہنے کا حکم دیا گیا کہ اگر کوئی حرکت کریں تو ان کو یہیں ختم کر دیا جائے۔ شراب پلا کر غنڈے تیار کر لیے گئے تھے کہ وہ ہمارے کیمپ پر حملہ آور ہوں' اور وہ ہوئے اور نہ صرف یہ کہ انھوں نے مردوں کے حصے پر حملہ کیا بلکہ عورتوں کے اجتماع کے لیے جو الگ کیمپ تیار کیا گیا تھا' اس کے اوپر بھی حملہ کیا اور اس کے اندر انھوں نے بوتلیں پھینکیں اور پتھر پھینکے۔ اس اجتماع سے پہلے ہمارے خلاف پراپیگنڈے کی ایک زبردست مہم چلائی گئی تاکہ روزانہ لوگوں کے دلوں میں ہمارے خلاف نفرت' غصے اور غضب کا زہر بھڑکایا جائے۔ یہ سب کچھ پرانی بات نہیں ہے' تازہ بات ہے' لیکن آپ کو یاد ہے کہ ہم نے اجتماع بھی کیا اور اس اجتماع میں گڑبڑ بھی ہوئی اور ہمیں اشتعال دلانے کے لیے جو کچھ کیا جا سکتا تھا' وہ کیا گیا۔ یہاں تک کہ قرآن کی توہین کی گئی' یہاں تک کہ عورتوں کے اجتماع کے اوپر پتھر بھی پھینکے گئے اور ہمارے ایک بیش قیمت کارکن کو دن دہاڑے ہماری آنکھوں کے سامنے شہید کیا گیا۔ خود میری طرف شست باندھ کر گولی چلائی گئی--- لیکن کیا ہمارا کام رک گیا! ہمارا کام رکا نہیں بلکہ جو کچھ تدبیریں انھوں نے کی

تھیں' وہ کام کے اور بڑھنے کا وسیلہ بنیں' کیوں؟ اس لیے کہ ہم نے [ہوش نہیں کھوئے] ' ہم نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا اور قابو میں رکھ کر جب دیکھا کہ پہاڑ اس طرف سے حائل ہے' تو ہم نے بہتے ہوئے پانی کی طرح دوسری طرف سے اپنا راستہ نکال لیا۔

اسی طرح اگر اب بھی آپ حکمت سے کام لیں تو اس وقت جتنی رکاوٹیں پائی جاتی ہیں' ان رکاوٹوں کے باوجود آپ کام کر سکتے ہیں۔ ضرورت آپ کے ارادے کی ہے۔ ضرورت اس کی نہیں کہ آپ کا دشمن آپ کو راستہ دے۔ دشمن راستہ کب دیا کرتا ہے' دشمن تو راستہ روکا ہی کرتا ہے۔ لیکن جس کو چلنا ہوتا ہے' اس کے اندر عزم موجود ہو اور عزم کے ساتھ اس کے اندر حکمت و دانائی بھی موجود ہو تو وہ اپنا راستہ نکال لیتا ہے (استفسارات' حصہ دوم' ص ۱۶۸-۱۷۱)۔

اسلامک پبلی کیشنز کی خاص پیشکش

امام العصر سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی سدا بہار تحریروں کا انتخاب

''افکارِ اعلیٰ'' سیریز

- دعوتِ دین کی بنیادیں
- عبادت کی حقیقت
- ہماری دعوت کیا ہے
- ایمان اور اطاعت
- مسلمان کی طاقت کا اصل راز
- زندگی کا نصب العین
- اسلام کا تصورِ زندگی
- اسلام کا نظامِ معیشت
- اسلام اور رواداری
- تقدیر کیا ہے
- اسلام کی دعوت
- عبادت کیا ہے
- خلافت کیا ہے
- لباس کیسا ہونا چاہئے
- امر بالمعروف ونہی عن المنکر
- قومیت کا اسلامی تصور
- اسلام کیسا مذہب ہے
- ہدایت و گمراہی کا راز
- اسلام میں عبادت کا تصور
- تعمیرِ سیرت کے اوصاف
- تزکیۂ نفس
- اسلامی نظامِ تعلیم
- قرآن کی معاشی تعلیمات
- نماز۔ دین کا ستون
- اسلامی انقلاب کے لیے ضروری اوصاف

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۱۳-ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور
فون : 7664504-7669546 فیکس : 7658674 ' e-mail: islamic@ms.net.pk

یوم التغابن

سید ابوالاعلیٰ مودودی

يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ط (التغابن ۶۴: ۹)

جب اجتماع کے دن وہ تم سب کو اکٹھا کرے گا۔ وہ دن ہو گا ایک دوسرے کے مقابلے میں لوگوں کی ہار جیت کا۔

اصل میں لفظ يَوْمُ التَّغَابُنِ استعمال ہوا ہے جس کے معنی میں اتنی وسعت ہے کہ اردو زبان تو کیا' کسی دوسری زبان کے بھی ایک لفظ' بلکہ ایک فقرے میں' اس کا مفہوم ادا نہیں کیا جا سکتا۔ خود قرآن مجید میں بھی قیامت کے جتنے نام آئے ہیں' ان میں غالباً سب سے زیادہ پر معنی نام یہی ہے۔ اس لیے اس کا مفہوم سمجھنے کے لیے تھوڑی سی تشریح ناگزیر ہے۔

تغابن غبن سے ہے جس کا تلفظ غَبْن بھی ہے اور غَبَن بھی۔ غَبْن زیادہ تر خرید و فروخت اور لین دین کے معاملے میں بولا جاتا ہے اور غَبَن رائے کے معاملے میں۔ لیکن کبھی کبھی اس کے برعکس بھی استعمال ہوتا ہے۔ لغت میں اس کے متعدد معنی بیان کیے گئے ہیں: غَبَنُوا خَبَرَ النَّاقَةِ ' ان لوگوں کو پتا نہیں چلا کہ ان کی اونٹنی کہاں گئی۔ غَبَنَ فُلَانًا فِي الْبَيْعِ ' اس نے فلاں شخص کو خرید و فروخت میں دھوکا دے دیا۔ غَبَنَ فُلَانًا ' اس نے فلاں شخص کو گھاٹا دے دیا۔ غَبِنْتُ مِنْ حَقِّي عِنْدَ فُلَانٍ ' فلاں شخص سے اپنا حق وصول کرنے میں مجھ سے بھول ہو گئی۔ غَبِيْن ' وہ شخص جس میں ذہانت کی کمی ہو اور جس کی رائے کمزور ہو۔ مَغْبُوْن وہ شخص جو دھوکا کھا جائے۔ الغبن' الغفلة' النسيان' فوت الحظ' ان يبخس صاحبك في معاملة بينك وبينه لضرب من الاخفاء ' غبن کے معنی ہیں غفلت' بھول' اپنے حصے سے محروم رہ جانا' ایک شخص کا کسی غیر محسوس طریقے سے کاروبار یا باہمی معاملے میں دوسرے کو نقصان دینا۔ امام حسن بصریؒ نے دیکھا کہ ایک شخص دوسرے کو بیع میں دھوکا دے رہا ہے تو فرمایا: هٰذا يغبن عقلك ' یہ شخص تجھے بیوقوف بنا رہا ہے۔

اس سے جب لفظ تغابن بنایا جائے تو اس میں دو یا زائد آدمیوں کے درمیان غبن واقع ہونے کا مفہوم

پیدا ہو جاتا ہے۔ تَغَابَنَ الْقَوْمُ کے معنی ہیں بعض لوگوں کا بعض لوگوں کے ساتھ غبن کا معاملہ کرنا۔ یا ایک شخص کا دوسرے کو نقصان پہنچانا اور دوسرے کا اس کے ہاتھوں نقصان اٹھا جانا۔ یا ایک کا حصہ دوسرے کو مل جانا اور اس کا اپنے حصے سے محروم رہ جانا۔ یا تجارت میں ایک فریق کا خسارہ اٹھانا اور دوسرے فریق کا نفع اٹھا لے جانا۔ یا کچھ لوگوں کا کچھ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں غافل یا ضعیف الرائے ثابت ہونا۔

اب اس بات پر غور کیجیے کہ آیت میں قیامت کے متعلق فرمایا گیا ہے ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ' وہ دن ہو گا تغابن کا۔ ان الفاظ سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ دنیا میں تو شب و روز تغابن ہوتا ہی رہتا ہے' لیکن یہ تغابن ظاہری اور نظر فریب ہے' اصلی اور حقیقی تغابن نہیں ہے۔ اصل تغابن قیامت کے روز ہو گا۔ وہاں جا کر پتا چلے گا کہ اصل میں خسارہ کس نے اٹھایا اور کون نفع کما لے گا۔ اصل میں کس کا حصہ کسے مل گیا اور کون اپنے حصے سے محروم رہ گیا۔ اصل میں دھوکا کس نے کھایا اور کون ہوشیار نکلا۔ اصل میں کس نے اپنا تمام سرمایۂ حیات ایک غلط کاروبار میں کھپا کر اپنا دیوالہ نکال دیا' اور کس نے اپنی قوتوں اور قابلیتوں اور مساعی اور اموال اور اوقات کو نفع کے سودے پر لگا کر وہ سارے فائدے لوٹ لیے جو پہلے شخص کو بھی حاصل ہو سکتے تھے اگر وہ دنیا کی حقیقت سمجھنے میں دھوکا نہ کھاتا۔

مفسرین نے یوم التغابن کی تفسیر کرتے ہوئے اس کے متعدد مطلب بیان کیے ہیں جو سب کے سب صحیح ہیں اور اس کے معنی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ بعض مفسرین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اس روز اہل جنت اہل دوزخ کا وہ حصہ مار لے جائیں گے جو ان کو جنت میں ملتا اگر وہ جنتیوں کے سے کام کر کے آئے ہوتے' اور اہل دوزخ جنتیوں کا وہ حصہ لوٹ لیں گے جو انھیں دوزخ میں ملتا اگر انھوں نے دنیا میں دوزخیوں کے سے کام کیے ہوتے۔ اس مضمون کی تائید بخاری کی وہ حدیث کرتی ہے جو انھوں نے کتاب الرقاق میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا: "جو شخص بھی جنت میں جائے گا اسے وہ مقام دکھا دیا جائے گا جو اسے دوزخ میں ملتا اگر وہ برا عمل کرتا' تاکہ وہ اور زیادہ شکرگزار ہو۔ اور جو شخص بھی دوزخ میں جائے گا اسے وہ مقام دکھا دیا جائے گا جو اسے جنت میں ملتا اگر اس نے نیک عمل کیا ہوتا' تاکہ اسے اور زیادہ حسرت ہو"۔

بعض اور مفسرین کہتے ہیں کہ اس روز ظالم کی اتنی نیکیاں مظلوم لوٹ لے جائے گا جو اس کے ظلم کا بدلہ ہو سکیں' یا مظلوم کے اتنے گناہ ظالم پر ڈال دیے جائیں گے جو اس کے حق کے برابر وزن رکھتے ہوں۔ اس لیے کہ قیامت کے روز آدمی کے پاس کوئی مال و زر تو ہو گا نہیں کہ وہ مظلوم کا حق ادا کرنے کے لیے کوئی ہرجانہ یا تاوان دے سکے۔ وہاں تو بس آدمی کے اعمال ہی ایک زرمبادلہ ہوں گے۔ لہٰذا جس شخص نے دنیا میں کسی پر ظلم کیا ہو وہ مظلوم کا حق اسی طرح ادا کر سکے گا کہ اپنے پلے میں جو کچھ بھی نیکیاں رکھتا

ہو ان میں سے اس کا تاوان ادا کرے' یا مظلوم کے گناہوں میں سے کچھ اپنے اوپر لے کر اس کا جرمانہ بھگتے۔ یہ مضمون بھی متعدد احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔ بخاری 'کتاب الرقاق میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: "جس شخص کے ذمے اپنے کسی بھائی پر کسی قسم کے ظلم کا بار ہو اسے چاہیے کہ یہیں اس سے سبکدوش ہو لے' کیونکہ آخرت میں دینار و درہم تو ہوں گے ہی نہیں۔ وہاں اس کی نیکیوں میں سے کچھ لے کر مظلوم کو دلوائی جائیں گی' یا اگر اس کے پاس نیکیاں کافی نہ ہوں تو مظلوم کے کچھ گناہ اس پر ڈال دیے جائیں گے"۔ اسی طرح مسند احمد میں حضرت جابر بن عبداللہ بن انیس کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: "کوئی جنتی جنت میں اور کوئی دوزخی دوزخ میں اس وقت تک نہ جا سکے گا جب تک کہ اس ظلم کا بدلہ نہ چکا دیا جائے جو اس نے کسی پر کیا ہو' حتیٰ کہ ایک تھپڑ کا بدلہ بھی دینا ہو گا"۔ ہم نے عرض کیا کہ یہ بدلہ کیسے دیا جائے گا جب کہ قیامت میں ہم ننگے بچے ہوں گے؟ فرمایا: "اپنے اعمال کی نیکیوں اور بدیوں سے بدلہ چکانا ہو گا" مسلم اور مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے ایک مرتبہ اپنی مجلس میں لوگوں سے پوچھا: "جانتے ہو مفلس کون ہوتا ہے؟" لوگوں نے عرض کیا ہم میں سے مفلس وہ ہوتا ہے جس کے پاس مال متاع کچھ نہ ہو۔ فرمایا: "میری امت میں مفلس وہ ہے جو قیامت کے روز نماز اور روزہ اور زکوٰۃ ادا کر کے حاضر ہوا ہو' مگر اس حال میں آیا ہو کہ کسی کو اس نے گالی دی تھی اور کسی پر بہتان لگایا تھا اور کسی کا مال مار کھایا تھا اور کسی کا خون بہایا تھا اور کسی کو مارا پیٹا تھا۔ پھر ان سب مظلوموں میں سے ہر ایک پر اس کی نیکیاں لے لے کر بانٹ دی گئیں۔ اور جب نیکیوں میں سے کچھ نہ بچا جس سے ان کا بدلہ چکایا جا سکے تو ان میں سے ہر ایک کے کچھ کچھ گناہ لے کر اس پر ڈال دیے گئے' اور وہ شخص دوزخ میں پھینک دیا گیا"۔ ایک اور حدیث میں' جسے مسلم اور ابوداود نے حضرت بریدہ سے نقل کیا ہے' حضورؐ نے فرمایا کہ: "کسی مجاہد کے پیچھے اگر کسی شخص نے اس کی بیوی اور اس کے گھر والوں کے معاملے میں خیانت کی تو قیامت کے روز وہ اس مجاہد کے سامنے کھڑا کر دیا جائے گا اور اس کو کہا جائے گا کہ اس کی نیکیوں میں سے جو کچھ تو چاہے لے لے"۔ پھر حضورؐ نے ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا: "پھر تمھارا کیا خیال ہے؟" یعنی تم کیا اندازہ کرتے ہو کہ وہ اس کے پاس کیا چھوڑ دے گا؟

بعض اور مفسرین نے کہا ہے کہ تغابن کا لفظ زیادہ تر تجارت کے معاملے میں بولا جاتا ہے۔ اور قرآن مجید میں جگہ جگہ اس رویے کو جو کافر اور مومن اپنی دنیا کی زندگی میں اختیار کرتے ہیں' تجارت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ مومن اگر نافرمانی کا راستہ چھوڑ کر اطاعت اختیار کرتا ہے اور اپنی جان' مال اور محنتیں خدا کے راستے میں کھپا دیتا ہے تو گویا وہ گھاٹے کا سودا چھوڑ کر ایک ایسی تجارت میں اپنا سرمایہ لگا رہا ہے جو آخر کار

نفع دینے والی ہے۔ اور ایک کافر اگر اطاعت کی راہ چھوڑ کر خدا کی نافرمانی اور بغاوت کی راہ میں اپنا سب کچھ لگا دیتا ہے تو گویا وہ ایک ایسا تاجر ہے جس نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی ہے اور آخرکار وہ اس کا خسارہ اٹھانے والا ہے۔ دونوں کا نفع اور نقصان قیامت کے روز ہی کھلے گا۔ دنیا میں یہ ہو سکتا ہے کہ مومن سراسر گھاٹے میں رہے اور کافر بڑے فائدے حاصل کرتا رہے۔ مگر آخرت میں جا کر معلوم ہو جائے گا کہ اصل میں نفع کا سودا کس نے کیا ہے اور نقصان کا سودا کس نے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں بکثرت مقامات پر بیان ہوا ہے۔ مثال کے طور پر آیات ذیل ملاحظہ ہوں: البقرہ ۲:۱۶' ۱۷۵' ۲۰۷۔ آل عمرٰن ۳: ۷۷' ۱۷۷۔ النساء ۴: ۷۴۔ التوبۃ ۹:۱۱۱۔ النحل ۱۶: ۹۵۔ فاطر ۳۵: ۲۹۔ الصف ۶۱: ۱۰۔

ایک اور صورت تغابن کی یہ بھی ہے کہ دنیا میں لوگ کفر و فسق اور ظلم و عصیان پر بڑے اطمینان سے آپس میں تعاون کرتے رہتے ہیں اور یہ اعتماد رکھتے ہیں کہ ہمارے درمیان بڑی گہری محبت اور دوستی ہے۔ بدکردار خاندانوں کے افراد' ضلالت پھیلانے والے پیشوا اور ان کے پیرو' چوروں اور ڈاکوؤں کے جتھے' رشوت خور اور ظالم افسروں اور ملازمین کے گٹھ جوڑ' بے ایمان تاجروں' صنعت کاروں اور زمین داروں کے گروہ' گمراہی اور شرارت و خباثت برپا کرنے والی پارٹیاں' اور بڑے پیمانے پر ساری دنیا میں ظلم و فساد کی علم بردار حکومتیں اور قومیں' سب کا باہمی سازباز اسی اعتماد پر قائم ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ تعلق رکھنے والے افراد اس گمان میں ہیں کہ ہم ایک دوسرے کے بڑے اچھے رفیق ہیں اور ہمارے درمیان بڑا کامیاب تعاون چل رہا ہے۔ مگر جب یہ لوگ آخرت میں پہنچیں گے تو ان پر یکایک یہ بات کھلے گی کہ ہم سب نے بہت بڑا دھوکا کھایا ہے۔ ہر ایک یہ محسوس کرے گا کہ جسے میں اپنا بہترین باپ' بھائی' بیوی' شوہر' اولاد' دوست' رفیق' لیڈر' پیر' مرید' یا حامی و مددگار سمجھ رہا تھا وہ دراصل میرا بدترین دشمن تھا۔ ہر رشتے داری اور دوستی اور عقیدت و محبت' عداوت میں تبدیل ہو جائے گی۔ سب ایک دوسرے کو گالیاں دیں گے' ایک دوسرے پر لعنت کریں گے' اور ہر ایک یہ چاہے گا کہ اپنے جرائم کی زیادہ سے زیادہ ذمہ داری دوسرے پر ڈال کر اسے سخت سے سخت سزا دلوائے۔ یہ مضمون بھی قرآن میں جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے جس کی چند مثالیں حسب ذیل آیات میں دیکھی جا سکتی ہیں: البقرہ ۲: ۱۶۷۔ الاعراف ۷: ۳۷ تا ۳۹۔ ابراہیم ۱۴: ۲۱' ۲۲۔ المومنون ۲۳: ۱۰۱۔ العنکبوت ۲۹: ۱۲' ۱۳' ۲۵۔ لقمن ۳۱: ۳۳۔ الاحزاب ۳۳: ۶۷' ۶۸۔ سبا ۳۴: ۳۱ تا ۳۳۔ فاطر ۳۵: ۱۸۔ الصّٰفّٰت ۳۷: ۲۷ تا ۳۳۔ ص ۳۸: ۵۹ تا ۶۱۔ حم السجدہ ۴۱: ۲۹۔ الزخرف ۴۳: ۶۷۔ الدخان ۴۴: ۴۱۔ المعارج ۷۰: ۱۰ تا ۱۴ عبس ۸۰: ۳۴ تا ۳۷۔

(تفہیم القرآن' ج ۵' ص ۵۳۶۔۵۴۰)

اصلاح نفس کے طریقے

شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری

شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری (متوفی ۱۳۸۱ء) معروف صوفی بزرگ ہیں۔ منیر (بہار) میں پیدا ہوئے۔ ان کے مکتوبات کے کئی مجموعے ہیں۔ ان میں مکتوبات صدی' مکتوبات بست و ہشت اور سہ صدی مکتوبات بہت مشہور ہیں۔ دیگر تصانیف میں شرح آداب المریدین' لطائف المعانی اور تحفہ غیبی شامل ہیں۔ ملفوظات میں معدن المعانی اور مسخ المعانی شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے خطوط تذکیر و تزکیہ اور اصلاح کے لیے نہایت موثر ہیں۔ انھوں نے اپنے خطوط میں امرا' وزرا اور خود سلطان فیروز تغلق کو عدل و انصاف اور رعایا سے نیک سلوک کرنے کی تلقین بھی کی۔ قصبہ بہار شریف (بھارت) میں آپ کا انتقال ہوا۔ ذیل کا مضمون مکتوبات صدی ' ترجمہ سید شاہ محمد الیاس بہاری " سے ماخوذ ہے۔ (مدیر)

آدمی کی طبیعت سرکش واقع ہوئی ہے۔ اس کی طینت بری صفتوں اور خراب اخلاق سے مرکب ہے' جیسا کہ آیات قرآنی اور احادیث نبویؐ میں آیا ہے۔ جب نفس امارہ کے تسلط کی شرارتوں کا اثر انسان کے احوال پر غلبہ کرتا ہے تو یہ گمراہیوں اور خسارے میں پڑ کر ایمان کی روشنی سے محروم رہ جاتا ہے اور درگاہ رب العزت سے دور ہو جاتا ہے۔ نفس امارہ' دل کا دشمن اور دین کا مخالف ہے۔ یہ ہمیشہ اپنی ہی تدبیر میں لگا رہتا ہے اور احکام شرع کی بجاآوری اور اس کی پیروی سے سرکشی کرتا ہے۔ آدمی کے لیے نفس کی آفت کفر کے فتنوں سے کہیں زیادہ بدتر ہے اور شیطان کی شرارت و مکر سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے' کیونکہ آدمی سے اس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ آدمی کا بڑا دشمن اور سخت ترین بلا یہی نفس ہے' یہ اندرونی دشمن ہے۔ اسی لیے اس کی دوا علاج بھی مشکل اور بہت دشوار ہے۔ جب چور گھر کے اندر ہی ہوتا ہے تو اس کو دفع کرنا آسان نہیں ہوتا۔ دوسری دقت یہ ہے کہ نفس ایک ایسا دشمن ہے جو آدمی کو محبوب اور پیارا ہوتا ہے اور محبوب کی عیب بینی سے آدمی اندھا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ نفس کی جو کچھ تباہ کاریاں دیکھتا ہے ان کو نیکی اور بھلائی سمجھتا ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو آدمی اس نفس کے ہاتھوں جلد ہی

تباہی اور ہلاکت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اسے ان باتوں کی خبر تک نہیں ہوتی۔

مجاہدہ نفس کا صحیح طریقہ

جب تم ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرو گے تو تمھیں معلوم ہو گا کہ سارے فتنے فساد، تباہی و بربادی، خواری و ہلاکت، معصیت و آفت جو مخلوق کو اول روز پیدائش سے پیش آئی ہیں اور قیامت تک پیش آئیں گی، وہ اسی نفس کی بدولت ہیں۔ جو شخص بھی بلاؤں میں مبتلا ہوا، اسی نفس کی وجہ سے ہوا۔ اگر ہواے نفس گمراہ نہ کرتی تو ضلالت اور معصیت کے فتنے کا وجود قیامت تک نہ پایا جاتا اور ساری مخلوق امن و سلامتی میں دن گزارتی۔ جب اتنا بڑا دشمن بغل میں ہو تو عقل مند کے لیے ضروری ہے کہ اسے دبا کر زیر کرے اور اس سے چھٹکارا پانے کی جدوجہد کرتا رہے۔ اس پر یکبارگی دھاوا بول دینا ممکن نہیں جیسا کہ دیگر دشمنوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ کیونکہ نفس طالب کی سواری اور آلہ ہے، اس لیے دفعتاً اس کو زیر کرنا اور یکبارگی اس کا چھوڑ دینا دشوار ہے۔ ایسا کرنے میں ضرر اور نقصان کا احتمال ہے۔ اس لیے انسان کو میانہ روی اختیار کرنے کی ضرورت ہے، اس طرح کہ اس کی پرورش کرو اور قوت دیتے ہوئے اس پر کاموں کا بوجھ ڈالو کہ وہ متحمل ہو سکے، اور اس حد تک کمزور کرو اور سختی سے کام لو کہ تمھارے حکم سے گریز نہ کرے۔ اس کے علاوہ جو طریقے ہیں وہ غلط ہیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ سخت ریاضت اور مجاہدۂ شاقہ کی وجہ سے نہایت کمزور ہو گئے تھے اور ہاتھ پاؤں ہلانے سے بھی عاجز تھے۔ ان کی آنکھیں حلقوں میں دھنس گئی تھیں۔ جب حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حال دیکھا تو پسند نہ فرمایا اور کہا: "یَا عَبْدَاللّٰہِ اِنَّ لِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقًّا (اے عبداللہ، تمھارے اوپر تمھارے نفس کا بھی حق ہے)، اس سختی سے ہاتھ کھینچ لو۔ اگر نفس کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرو گے تو پکڑے جاؤ گے اور گنہگار ہو گے"۔ اس سے معلوم ہوا کہ ریاضت اور مجاہدۂ نفس کے لیے علم کی ضرورت ہے تاکہ ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ نفس ہلاک بھی نہ ہو، اور نہ تم پر غالب ہو سکے اور نہ تمھاری نافرمانی کر سکے۔

اصلاح نفس میں اعتدال کی راہ

پس میانہ روی کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے منہ میں تقویٰ کی لگام ڈالو اور پرہیزگاری اختیار کرو۔ اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ نفس ایک نافرمان، سرکش اور موذی جانور ہے تو تم اس کے منہ میں کس طرح لگام دو گے! تو جان رکھو کہ اس میں حیلے کی ضرورت ہے۔ پہلے اس کو ذرا نرم کرو تاکہ لگام لینے کے قابل ہو جائے۔ اس راستے کے عالموں نے کہا ہے کہ نفس کو نرم کرنے کے تین طریقے ہیں:

ایک، یہ کہ نفس کو خواہشوں اور لذتوں سے روک دو، کیونکہ جب چوپائے دانہ گھاس نہیں پاتے تو

نرم ہو جاتے ہیں۔ عالموں میں سے کسی نے کہا ہے کہ نفس کی سرکشی اور جہالت اس حد تک ہوتی ہے کہ جب وہ چاہتا ہے کہ گناہ کرے اور عذاب مول لے' اور تم اس وقت خدا' رسول' جملہ انبیا' کتاب اور سلف صالحین کو شفیع بنا کر سامنے لاؤ' اور موت' قبر' قیامت' بہشت اور دوزخ سب اس کے سامنے رکھ دو' تو بھی وہ ہرگز باز نہ آئے گا' نہ گناہ سے پیچھے ہٹے گا' نہ خواہشوں سے دست بردار ہو گا۔ لیکن جب دانہ پانی روک دیا جائے گا تو ساری شرارتیں غائب ہو جائیں گی۔

دوسرے' یہ کہ عبادت کا بھاری بوجھ اس پر لاد دو کیونکہ جب خچر پر زیادہ بھاری بوجھ لاد دیا جاتا ہے تو وہ سیدھا ہو جاتا ہے' خاص کر ایسی حالت میں کہ دانہ پانی کی مار اس پر پڑ چکی ہو۔

تیسرے' یہ کہ خداوند تعالیٰ سے امداد مانگو اور اس کی بارگاہ میں پناہ ڈھونڈو۔ بغیر اس کے' اس کی شرارتوں سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ اگر ان تینوں چیزوں پر قائم رہو گے تو تمھارا سرکش نفس تمھارا فرماں بردار ہو جائے گا اور لگام قبول کر لے گا۔ جب ایسی حالت دیکھو تو جلدی کرو اور تقویٰ کی لگام اس کے منہ میں ڈال دو اور اس کی شرارت سے بے فکر ہو جاؤ۔

تقویٰ کیا ہے؟

اگر تم پوچھو کہ تقویٰ کیا ہے جس کی لگام بنائیں؟ تو سنو! تقویٰ ایک بہت بڑا خزانہ ہے۔ ایک وسیع ملک ہے جس میں دنیا اور آخرت کی تمام چیزیں جمع کر کے رکھ دی گئی ہیں اور اسی کے تحت ایک خصلت رکھی ہے جس کا نام تقویٰ ہے۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ توریت میں ہے کہ اے بنی آدم' تقویٰ اختیار کرو اور جہاں چاہے آرام کی نیند سو رہو۔ یہ خصلت تمام نیکیوں کی جامع ہے اور جملہ مہمات کے لیے کافی ہے۔ بندے کو تمام درجات اور کرامات پر پہنچا دیتی ہے۔ یہ ایک ایسی اصل ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔

اب سنو! تفسیر زاہدی میں ہے کہ تقویٰ کی دو قسمیں ہیں: "اصل" اور "فرع"۔ "اصل" تو کفر سے توبہ کر کے ایمان لانا ہے اور "فرع" گناہوں کو چھوڑ کر طاعت و بندگی کرنا۔ مشائخ نے کہا ہے' کہ تقویٰ کی تین منزلیں ہیں: ایک' شرک سے تقویٰ۔ دوسرے' بدعات سے تقویٰ۔ تیسرے' معاصی سے تقویٰ۔ پس تقویٰ کے یہ معنی ہوئے کہ دین میں جن جن باتوں سے ضرر و نقصان کا ڈر ہے' ان سے پرہیز کرنا۔ تم نہیں دیکھتے کہ پرہیز کرنے والے بیمار کو بھی "متقی" کہتے ہیں کیونکہ کھانے پینے کی چیزوں اور ایسے پھل وغیرہ سے جو اس کو نقصان پہنچانے والے ہیں' پرہیز کرتا ہے۔ وہ چیزیں' جن سے دین میں نقصان کا خوف ہے' ان کی دو قسمیں ہیں: ایک' محض حرام و معصیت اور دوسرے' حلال چیزوں میں زیادتی اور فضولیات۔ یہ بہت ہوتا ہے کہ حلال چیزوں میں زیادتی آدمی کو حرام اور گناہ کی طرف لے جاتی ہے۔ جو شخص

چاہے کہ دین میں نقصان لانے والی باتوں سے امن میں رہے' اس کے لیے ضروری ہے کہ محض حرام اور معصیت سے پرہیز کے علاوہ حلال فضول سے بھی اپنا دامن بچائے رکھے۔ پس جامع و مانع تقویٰ ان چیزوں سے پرہیز کرنا ہے جو معصیت ہیں اور دین کو نقصان پہنچانے والی ہیں اور فضول حلال سے بھی دامن بچانا ہے۔ اس کام میں غفلت نہیں کرنی چاہیے۔ فرصت کو غنیمت جانیں' ممکن ہے کہ ہم آیندہ تقویٰ کرنا چاہیں اور نہ کر سکیں۔

دنیا کی بے ثباتی

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا ہے کہ دنیا تین دن کی ہے۔ ایک' وہ کل جو گزر چکا جس سے تجھے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ دوسرے' وہ کل جو آنے والا ہے' اس کے متعلق نہیں معلوم تو اسے پائے گا' یا نہ پائے گا۔ تیسرا وہ دن ہے جس میں تو اس وقت ہے۔ لے دے کے یہی تیرے ہاتھ میں ہے' اس کو غنیمت جان۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ دنیا تین ساعت سے زیادہ نہیں ہے۔ ایک ساعت گزر چکی جس سے تو نے کچھ حاصل نہ کیا۔ دوسری ساعت کا یقین نہیں کہ پائے گا یا نہ پائے گا۔ تیسری ساعت وہ کہ تو اس میں ہے' تو درحقیقت تیری عمر یہی ایک ساعت ہے۔ ایک محقق بزرگ نے کہا ہے کہ دنیا تین سانس کے برابر ہے۔ ایک سانس تو گزر چکی اور اس میں جو کچھ تو نے کیا دھرا ہے' تجھے معلوم ہے۔ دوسری سانس کا حال معلوم ہی نہیں کہ آئے گی یا نہ آئے گی۔ تیسری سانس وہ جو تو نے لی ہے۔ اکثر لوگوں کو دیکھا ہے کہ ایک سانس کے بعد دوسری سانس نہیں لے سکے اور مر گئے۔ پس تم نہ ایک دن کے مالک ہو' نہ ایک ساعت کے' بس یہی ایک سانس تمھاری ہے۔ لہٰذا ہوش سنبھالو' اٹھ بیٹھو' اور جلدی کرو' اور اسی سانس میں توبہ اور بندگی کر لو۔ ممکن ہے دوسری سانس نہ آئے اور خاتمہ ہو جائے۔

رزق و روزی کا غم نہ کرو۔ یاد رکھو! وہ آدمی تباہ ہو جاتا ہے جو ایک دن یا ایک ساعت کا غم کرتا ہے' جب کہ وہ دوسری ہی سانس میں مر جائے گا۔ اور وہ یاد کرو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: خدا کی قسم! میں زمین پر قدم رکھنے کے بعد گمان نہیں کرتا کہ قدم اٹھاؤں گا یا نہ اٹھاؤں گا' لقمہ منہ میں لے کر یقین نہیں کرتا کہ اسے حلق سے اتار سکوں گا۔ پس انسان کو چاہیے کہ اس پر قائم ہو جائے اور رات دن اسی کو یاد کرتا رہے' بالضرور اس کی امیدیں مختصر ہو جائیں گی اور اپنے نفس کو بندگی میں تیزی' توبہ میں جلدی' دنیا میں زہد اور موت کے لیے تیاری میں مشغول ہونے والا دیکھے گا۔

(ترتیب و تدوین: عبدالرشید صدیقی)

انقلابی حکمتِ عملی

بنیادی اصول اور تقاضے

خرم مراد

اسلام نے قرآن و حدیث کی روشنی میں' مختلف حالات میں' اسلامی تحریک کو درپیش چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے مختلف اصولوں کا تعین کیا ہے' جن کی روشنی میں ایک موثر حکمت عملی بنائی جا سکتی ہے۔ کوئی بھی تحریک جو فریضہ اقامت دین کی ادائیگی کے لیے اٹھے' اسے اپنی حکمت عملی حسب ذیل اصولوں کی روشنی میں مرتب کرنا ہوگی:

جبر کے نظام کی نفی: حکمت عملی کا پہلا اصول یہ ہے کہ کوئی ایسا سیاسی' معاشی یا معاشرتی نظام جس میں آدمی جبر کے شکنجے کے اندر کس جائے' اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ تو گھر کے اندر کوئی ایسا نظام قائم کرنے کی اجازت نہیں دیتا جس میں والدین' بچوں پر جبر کریں یا بچے والدین پر۔ کوئی ماں یا کوئی باپ' بچوں کو ضرر پہنچانے والے احکام نہیں دے سکتے۔ سب سے بڑا ضرر تو یہ ہے کہ ان کے دین کے اندر خلل آئے اور وہ اللہ کی راہ پر چلنے سے باز رہیں۔ اسی طرح اسلام معیشت' سیاست اور حکومت میں' اس بات کو بالکل برداشت نہیں کرتا کہ انسان کسی طریقے سے بھی جبر کے شکنجے میں کسا جائے' اس کے اوپر کوئی آمریت مسلط کی جائے اور کوئی شخص لوگوں کو ڈنڈے کے زور سے اپنی مرضی پر چلائے۔ اسلام اسے گناہ عظیم تصور کرتا ہے۔ لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ (البقرہ ۲:۲۵۶)' اس اصول کی بنیاد ہے۔

ترجیحات کے تعین کا مسئلہ: دوسرا اصول یہ ہے کہ جب انسان اس دنیا میں عمل کی آزمایش کے لیے بھیجا گیا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اچھا یا برا عمل کیا ہے؟ نیکی یا بدی کیا ہے اور نیکی یا بدی کے درمیان انسان کس طرح فرق کرے؟ بہ ظاہر تو یہ بڑا آسان مسئلہ ہے اور زندگی کے بہت سے حالات اور مواقع میں واقعی بڑا آسان ہے۔ لیکن "بر" (نیکی) اور "اثم" (بدی) کے نظام کو سمجھنا' کوئی بہت سادہ اور آسان بات بھی نہیں ہے۔ چونکہ انسان عمل کی آزمایش کے لیے اس دنیا میں آیا ہے' پس اس کے لیے یہ

سمجھنا ضروری ہے کہ نیکی اور بدی کا نظام کن اصولوں پر قائم ہے۔

قرآن مجید نے نیکی اور بدی کے نظام کو جن اصولوں پر قائم کیا ہے' اور اس کے اندر جو حکمت ملحوظ رکھی ہے' اس میں بنیادی بات یہ ہے کہ جس کام میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور مرضی ہو' وہ نیکی ہے اور جس کام سے وہ ناراض ہوتا ہو' وہ بدی ہے۔

یہ ایک واضح اور عمومی اصول ہے۔ لیکن زندگی کے اندر بے شمار ایسے مواقع آتے ہیں' جہاں انسان کو نیکی اور بدی کے انتخاب میں ترجیحات کا مسئلہ پیش آتا ہے۔ مثلاً آدمی مر رہا ہے اور دوسری طرف شراب رکھی ہوئی ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے' ایسی صورت حال میں کیا کیا جائے؟ یا آدمی بیمار ہے' وضو کرے یا نہ کرے؟ وضو کرنا بہ ظاہر ضروری ہے' نیکی ہے لیکن کیا وضو کے بغیر نماز ہو جائے گی؟ قرآن نے کہا' ہاں تیمم سے ہو جائے گی۔ گویا ترجیحات کا یہ مسئلہ زندگی میں کئی مرتبہ پیش آتا ہے۔ کچھ معاملات میں قرآن نے خود یہ وضاحت کر دی ہے کہ کون کون سے حالات اور مواقع ہیں' جن میں احکام میں تبدیلی آسکتی ہے مگر کچھ معاملات میں وضاحت نہیں کی گئی۔ اس طرح ایک ہی بات نیکی بھی بن سکتی ہے اور بدی بھی۔ مثلاً نماز پڑھنا نیکی کا کام ہے لیکن اگر آدمی یہ کہے کہ نہیں' دن میں چھ نمازیں فرض ہیں' چھٹی نماز پڑھنا بھی ضروری ہے تو یہ نماز نیکی کا کام نہیں بلکہ بدی کا کام ہو گا۔ لہٰذا نیکی اور بدی کا تعین محض ظاہری شکل سے نہیں ہو سکتا' بلکہ اس کے لیے بڑی حکمت اور سمجھ بوجھ کی ضرورت ہے۔

تحریک اسلامی کو انفرادی' اجتماعی اور ملکی سطح پر' کن حالات میں' کون کون سے سیاسی' معاشی اور معاشرتی اقدامات کرنے ہوں گے جن سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو سکے' یہاں بھی ترجیحات کا مسئلہ پیش آتا ہے۔

خون بہانا بہ ظاہر بہت برا کام ہے۔ اور اللہ کے نزدیک اتنا ناپسندیدہ کہ فرمایا گیا کہ جس نے ایک آدمی کو قتل کیا' گویا اس نے سب انسانوں کو قتل کیا۔ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعاً (المائدہ ۵:۳۲)۔ لیکن نظام حق کو قائم کرنے کے لیے اگر کسی مرحلے پر واقعی تلوار نکالنی پڑے تو اس سے بڑا نیکی کا کام بھی کوئی نہیں ہے۔ اس وقت یہ عظیم ترین نیکی بن جاتی ہے۔ یہ حالات اور مواقع کے لحاظ سے واقع ہونے والی تبدیلیاں ہیں اور جب تک آدمی اس حکمت کو پوری طرح نہ سمجھے' اس وقت تک وہ حسن عمل کی آزمایش میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

دنیا میں نیکی اور بدی یا "بر" اور "اثم" کا نظام نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر شاہ ولی اللہؒ نے اپنی کتاب الحجۃ اللہ البالغہ میں کئی ابواب اس نظام کی توضیح و اہمیت پر صرف کیے ہیں۔ یہ دراصل پورے دین کی بنیاد ہے۔ اس کے اندر سب سے پہلا اور اہم اصول ترجیحات کا نظام ہے۔

قرآن مجید سے ثابت ہے کہ ساری نیکیاں اور ساری برائیاں ایک ہی درجے کی نیکیاں اور برائیاں نہیں ہوتیں۔ اَجَعَلْتُمْ سِقَایَۃَ الْحَآجِّ وَعِمَارَۃَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰھَدَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ لَا یَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰہِ (التوبۃ۹:۱۹) کیا تم لوگوں نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی مجاوری کرنے کو اس شخص کے کام کے برابر ٹھیرا لیا ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور روز آخر پر اور جس نے جانفشانی کی اللہ کی راہ میں؟ اللہ کے نزدیک تو یہ دونوں برابر نہیں ہیں۔ یعنی نیکیوں اور برائیوں کے درجات میں اللہ تعالیٰ نے خود فرق رکھا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نیکیوں اور برائیوں کی وضاحت کرتے ہوئے ان کے مختلف درجات قائم فرمائے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں' اگرچہ وہ نماز پڑھتا ہو' اور اگرچہ وہ روزہ رکھتا ہو' اور اگرچہ وہ مسلمان ہونے کا زعم کرتا ہو' وہ منافق ہے اگر وہ یہ تین کام کرے: جب بات کرے تو جھوٹ بولے' وعدہ کرے تو اس کو توڑ دے' اور اگر کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو اس میں خیانت کرے---- پس عمل کرنے کے باوجود بندوں کے حقوق کے آگے نماز' صدقات اور روزے جیسی چیزیں محو ہو جاتی ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے الفاظ میں' نیکیوں کا بھی ایک شجرۂ نسب ہے۔ بعض نیکیاں ماں باپ کی حیثیت رکھتی ہیں اور بعض ان کے بچوں کی۔ بعض کی حیثیت بیج کی ہے اور بعض کی تنے کی۔ بعض شاخیں ہیں اور بعض پھول پتے جو تزئین و آرایش کے لیے لگا دیے جاتے ہیں۔ لوگوں کی نگاہ اسی زینت کے اندر الجھ کر رہ جاتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ درخت کے اندر تو صرف پھول اور پتے ہی ہیں۔ گویا اگر پھول اور پتے نہ رہیں تو دین کا بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔ مگر دین کا نقصان' ان پھول پتوں کا نہ رہنا نہیں ہے' بلکہ جڑ کا غائب ہو جانا' ایمان کا نہ ہونا اور تنے کا نہ ہونا ہے' کہ جس سے اعمال صالحہ کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کلمہ طیبہ کی مثال ایک درخت سے دی ہے۔ درخت کے اندر سب چیزیں یکساں اہمیت کی نہیں ہوتیں۔ اصل چیز تو بیج ہے' کلمہ طیبہ کا بیج' جو کہ پورے درخت کی بنیاد ہوتا ہے۔ درخت کا تنا وہ بنیاد ہے جس پر پورا دین قائم ہوتا ہے۔ پھر بڑی بڑی شاخیں ہوتی ہیں اور اس کے بعد وہ سارے پھول اور پتے ہوتے ہیں جو بہ ظاہر نظر آتے ہیں لیکن اصل تو جڑ' بیج اور تنا ہی ہے۔ اگر جڑ کھوکھلی ہو جائے تو اوپر کے پھول اور پتوں (ظاہری اعمال) کی حیثیت حقیقی کی دین نہیں ہے۔

اس طرح سے دین نے ترجیحات کا ایک پورا نظام قائم کیا ہے۔

اگر آپ بدی کے حوالے سے یہ جاننا چاہیں کہ وہ کون سی برائیاں ہیں جو قرآن مجید کی نظر میں سب سے اہم ہیں' تو آپ کو بڑا تعجب ہو گا کہ آج ۱۴ سو سال بعد امت جن چیزوں کو بڑی شدومد سے برائی تصور کرتی ہے' ان کا قرآن مجید میں ذکر ہی نہیں ہے' یا اگر ہے تو برائے نام۔ اس کے مقابلے میں وہ برائیاں جن کو امت بہت ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرتی ہے بلکہ واہ واہ کرتی ہے اور ان کی تعریف کرتی ہے' قرآن مجید

کی رو سے وہ بہت عظیم الشان برائیاں اور بڑے جرائم ہیں۔ مثلاً قرآن مجید جھوٹ اور منافقت کو سب سے بڑا جرم بتاتا ہے۔ اسی طرح عہد کو توڑنے' رشتوں کو کاٹنے' زمین میں فساد برپا کرنے اور جبر کو عظیم الشان برائیاں قرار دیتا ہے۔

انسان آزاد اور خود مختار ہے۔ اس کی یہ آزادی اور خود مختاری کسی سیاسی' معاشی یا معاشرتی مقصد کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ آزادی اس کے دین کے لیے' اللہ کے امتحان میں کامیاب ہونے کے لیے' اور جنت و دوزخ میں سے کسی ایک راستے پر چلنے کے لیے ضروری ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے شدت سے اس پر تنقید کی ہے' کہ آدمی زمین میں اپنے آپ کو سب سے بڑا تصور کرے' تکبر اور غلو کے راستے پر چلے' لوگوں پر اپنی مرضی مسلط کرے اور فساد برپا کرے۔

فساد کی تعریف کیا ہے اور بگاڑ کیا ہے؟

قرآن فرعون کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ: اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِیَعًا یَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ یُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَیَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ○ (القصص ۲۸: ۴) واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ان میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا' اس کے لڑکوں کو قتل کرتا اور اس کی لڑکیوں کو جیتا رہنے دیتا تھا۔ فی الواقع وہ مفسد لوگوں میں سے تھا۔ یعنی زندگی کے اندر بگاڑ یا فساد یہ ہے کہ آدمی کھیتی اور نسل کو برباد کرے اور زمین میں فساد پھیلانے کے لیے حکومت کرے۔ فساد اور بگاڑ کی اصل تعریف یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو دوسروں پر مسلط کرے اور کہے کہ صرف میری مرضی قانون ہے' جو میں چاہوں گا وہ ہو گا اور لوگوں کو وہی بات ماننا پڑے گی۔ جب فرعون نے کہا تھا کہ انا ربکم الاعلٰی ○ (النزعٰت ۷۹: ۲۴) میں تمھارا سب سے بڑا رب ہوں' تو اس نے اپنی مرضی اور قانون لوگوں پر مسلط کرنا چاہا تھا۔ اس نے یہ مطالبہ نہیں کیا تھا کہ لوگ اس کے آگے لازماً سجدہ کریں اور اس کی پرستش کریں۔ اس کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ میری مرضی ہی قانون ہو گی۔ ملک کے باشندوں کی قسمت کا فیصلہ میرے قانون اور حکم کے مطابق ہو گا' اس لیے کہ میں ان کا رب' آقا اور سب سے بڑا حکمران ہوں۔ ایسے ہی لوگوں کو قرآن فساد کرنے والا کہتا ہے جو لوگوں کی آزادی اور خود مختاری چھیننے کی کوشش کرتے ہیں۔ "احبار" (یہودیوں کے پیشوا' عالم یا زاہد) اور "رہبان" (عیسائیوں کے راہب یا تارک الدنیا) کا رب بن جانے کا تذکرہ بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔

قرآن مجید غلو اور استکبار کو بھی اسی بنا پر عظیم جرائم میں شمار کرتا ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا کہ جس کے اندر رائی برابر بھی تکبر پایا جائے گا وہ جنت میں داخل نہیں ہو سکتا' یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے گزر جائے۔ اس توضیح کے ذریعے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے' کہ جو اپنے آپ کو بڑا سمجھتا

ہو اور بڑا سمجھ کر لوگوں کی گردنوں کے اوپر اپنے آپ کو مسلط کرے، اس کا جنت میں داخلہ ایسے ہی ناممکن ہے جس طرح سوئی کے ناکے میں سے اونٹ کا گزرنا۔

اسی طرح دوسری نیکیاں اور برائیاں ہیں، جن کو قرآن نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لہٰذا، نیکی اور بدی کے درجات میں اس فرق کی بنا پر ترجیحات کے نظام کی اہمیت مسلمہ ہے۔ اگر ترجیحات کا یہ نظام بگڑ جائے اور درہم برہم ہو جائے تو پھر دین کا پورا نظام بگڑ سکتا ہے اور درہم برہم ہو سکتا ہے۔ جب دین کو ماننے والی کوئی قوم ترجیحات کے اس نظام کو ضائع کر دیتی ہے تو اس کے بعد وہ دین کو بھی ضائع کر دیتی ہے۔ پھر زوال اور ہلاکت اس کا مقدر ہو جاتا ہے۔

اس ضمن میں بخاری شریف کے اندر مشہور واقعہ آتا ہے، جس سے ترجیحات کے اس نظام کی اہمیت بہ خوبی اجاگر ہو جاتی ہے۔ یہ بات روز مرہ کے مشاہدے میں ہے کہ عام طور پر نمازی جس جگہ کھڑے ہو کر فرض ادا کرتے ہیں، وہاں سے تھوڑا سا ہٹ کر سنت اور نفل پڑھتے ہیں۔ اس عمل کی بنیاد کیا ہے؟ یہ جاننا ضروری ہے۔ اس میں حکمت کا ایک نہایت اہم اصول پنہاں ہے۔

مسجد نبویؐ میں ایک دفعہ لوگوں نے فرض نماز ادا کی اور جہاں فرض پڑھے گئے تھے وہیں کھڑے ہو کر سنت اور نفل پڑھنا شروع کر دیے۔ یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ نے کہا کہ پچھلی قومیں اسی وجہ سے تباہ و برباد ہو گئیں۔ عمرؓ ابن خطاب مزاج شناس رسولؐ تھے اور حکمت و فراست کے مالک تھے۔ انھوں نے بغیر اس کے کہ ان پر کوئی وحی اترتی، یہ بات کہی کہ پچھلی قومیں اسی عمل کی وجہ سے ہلاک ہو گئیں۔ حضورؐ نے فرمایا: "عمرؓ تم نے بڑی صحیح بات کہی"۔ حضرت عمرؓ کا یہ قول نہایت اہمیت کا حامل ہے جس کی تائید نبی کریمؐ نے بھی فرمائی۔ میں نے اس پر غور کیا کہ آخر اس کے اندر کیا راز اور مصلحت پنہاں ہے۔ بہت عرصے بعد میری سمجھ میں یہ آیا کہ دراصل فرض، سنت اور نفل کا اپنا اپنا مقام ہے، اگر ترجیحات کا یہ نظام علامتی اور عملی سطح پر غلط ملط ہو جائے تو پھر امت ہلاکت کی طرف جاتی ہے۔ اور یہی ہمارے ساتھ ہوا۔

مثال کے طور پر، جہاد جو چوٹی کا عمل تھا، وہ سب سے پیچھے چلا گیا اور کسی گوشے میں بیٹھ کر ذکر کرنا جو جنت کی کیاریوں میں سے کچھ پودے چننے کا کام تھا، سب سے اعلیٰ عمل ہو گیا۔ لوگ ذکر و فکر میں مست ہو گئے، خانقاہی مزاج میں پختہ تر ہوتے چلے گئے اور امت اپنے مقاصد سے غافل ہوتی چلی گئی۔ جو مشن فرض کے طور پر دیا گیا تھا وہ پس پشت ڈال دیا گیا، اور جو سنت اور نوافل تھے یعنی درخت کے پتے، پھول اور آرایشیں، لوگ انھی کے ہو کر رہ گئے۔ سب توجہ اسی پر لگ گئی اور اسے اہم ترین چیز تصور کیا جانے لگا۔ اسی لیے حضرت عمرؓ نے اس عمل کو قوموں کی ہلاکت و بربادی کے مترادف قرار دیا تھا، کہ انھوں نے اپنے اصل سرمائے کو ضائع کر دیا، ترجیحات کے نظام کو بدل کر رکھ دیا اور یوں تباہی و بربادی ان کا مقدر ہو گئی۔

قرآن مجید نے بنی اسرائیل کا تذکرہ کرتے ہوئے اس پہلو پر متعدد مقامات پر توجہ دلائی ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا مشہور جملہ ہے کہ تم مچھر چھانتے ہو اور اونٹ نگل جاتے ہو۔ یعنی بڑے بڑے جرائم کا تو تم کھلم کھلا ارتکاب کرتے ہو اور انھیں خاطر میں نہیں لاتے' جب کہ معمولی معمولی باتوں کو اہمیت دیتے ہو۔

کوفہ کا مشہور واقعہ ہے کہ وہاں کے لوگ کسی فقیہہ کے پاس پہنچے اور کہا کہ: نماز کے دوران اگر مچھر مر جائے اور اس کا خون نمازی کے کپڑوں کو لگ جائے تو کیا نماز ہو گی یا نہیں؟ انھوں نے کہا: سبحان اللہ! کربلا میں رسولؐ کے نواسے کو شہید کرتے ہوئے یہ نہیں پوچھا کہ اس کے خون کے بعد نماز ہو گی یا نہیں' لیکن مچھر کے خون کے بارے میں تمھیں فکر ہے کہ اگر کپڑوں پر لگ گیا تو آیا نماز ہو گی یا نہیں!--- یہ ترجیحات کی ترتیب کو بدل دینے' نظام ترجیحات کو الٹ پلٹ دینے اور ضائع کر دینے ہی کا نتیجہ ہے کہ دین کا پورا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔

نیکی اور بدی کا صحیح تصور : قرآن مجید میں ایک اصول یہ بیان کیا گیا ہے کہ اطاعت لازمی و ناگزیر ہے۔ یعنی دین کے جتنے بھی ظاہری احکام ہیں' ان سب کی اطاعت لازم ہے۔ اس میں کوئی عذر یا تاویل برداشت نہیں ہو سکتی۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ نماز پڑھنے سے کیا ہوتا ہے' میں تو بندوں کی خدمت کرتا ہوں' اللہ کو ویسے ہی یاد کر لیتا ہوں۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اس بات کی تصریح بھی کر دی گئی ہے' کہ اصل نیکی ظواہر میں نہیں' بلکہ روح و باطن میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں جہاں قصاص' وراثت' نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ' جہاد اور طلاق و نکاح کے احکام بیان کیے گئے ہیں وہاں نیکی کا تصور بیان کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے کہ: لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○ (البقرہ ۲ : ۱۷۷) نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف' بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر' مسکینوں اور مسافروں پر' مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے' نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔ اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں' اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں۔ یہ ہیں راست باز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں۔ یعنی اللہ کے نزدیک بس یہی لوگ اپنے ایمان کے دعوے میں سچے ہیں' نہ کہ وہ جو کعبے کی طرف منہ کر کے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

کفار قریش کا عقیدہ تھا کہ گھر کے پیچھے سے آنا چاہیے۔ قرآن نے کہا کہ نیکی یہ نہیں ہے کہ گھر کے آگے سے آؤ یا پیچھے سے بلکہ تقویٰ تو کچھ اور ہی چیز ہے۔ اسی طرح فرمایا: لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (الحج ۲۲ : ۳۷) یعنی تم جو قربانی کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو اس کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تمھارے دلوں کے اندر جو نیت اور تقویٰ ہے، وہ قبول فرماتا ہے۔ قرآن نے اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ اصل چیز نیت اور روح ہے۔ وہی کام قبول ہوں گے جو اللہ کی رضا کے لیے ہوں گے اور جو کام اللہ کی رضا کے لیے نہیں ہوں گے وہ قبول نہیں ہوں گے، بہ ظاہر شکل و صورت کچھ بھی ہو۔

کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر آدمی ویسے ہی روح یا روحانی تزکیہ حاصل کر لے تو پھر اعمال کی کیا ضرورت ہے؟ ذرا مثال سے سمجھیے: پانی محفوظ رکھنے کے لیے گلاس یا برتن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ گلاس کی کیا ضرورت ہے، ہم ویسے ہی پانی رکھ لیں گے۔ یہ بات ناقابل عمل ہو گی، اس لیے کہ پانی بغیر گلاس یا کسی برتن کے نہیں رکھا جا سکتا۔ اسی طرح روح کو تروتازہ رکھنے کے لیے نماز، زکوٰۃ اور اعمال کی ضرورت ہوتی ہے۔ یقیناً پانی کے لیے گلاس ضروری ہے مگر جو خالی گلاس لے کر بجاتا پھرے کہ اسی سے میری پیاس بجھ جائے گی، تو اسے آپ کیا کہیں گے؟ جس طرح گلاس کے اندر پانی ہونا چاہیے، اسی طرح اعمال کے اندر روح ہونی چاہیے اور ان کے پیچھے نیت، تقویٰ اور رضائے الٰہی کی طلب کا جذبہ کارفرما ہونا چاہیے۔ یہ وہ چیزیں ہیں، جو اعمال میں وزن اور قدر و قیمت پیدا کرتی ہیں۔

اعمال کی قدر و قیمت نیت سے متعین ہوتی ہے۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نبی کریمؐ نے فرمایا: اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَاِنَّمَا لِامْرِئٍ مَا نَوٰى (متفق علیہ) اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر آدمی کے لیے وہی ہے جس کی وہ نیت کرے۔ نیت کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اگر ہجرت اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے ہو گی تو وہ اللہ اور رسولؐ کے لیے شمار ہو گی اور اگر کسی عورت یا دنیاوی غرض کے لیے ہو گی تو وہ اسی غرض کے لیے شمار ہو گی۔ جہاد جیسا چوٹی کا عمل اگر قومیت، عصبیت، حمیت یا داد و شجاعت وصول کرنے کے لیے یا محض مہم جوئی کی نیت سے ہو گا تو اللہ کے ہاں جہاد شمار نہ ہو گا۔

قرآن مجید نے اس بات کو واضح کر دیا ہے، کہ قیامت کے روز اعمال کی ظاہری شکل و صورت کا اعتبار نہیں ہو گا، بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ اس کے پیچھے کیا نیت اور روح کارفرما تھی۔ اعمال اگر روح سے خالی اور بے جان ہوں گے، تو وہ کام نہیں آئیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اعمال میں روح پیدا کرنے کی کوشش کرنا آدمی پر فرض ہے۔ یہ مسئلہ کیفیت کا نہیں ہے، بلکہ نیت کا ہے۔ نیت کا خالص ہونا ضروری ہے، اس لیے کہ اعمال کی قدر و قیمت کا تعین نیت کی بنیاد پر ہی ہو گا۔ یہ وہ اہم اصول ہے جسے قرآن مجید نے بڑی شدت کے

ساتھ بیان کیا ہے۔

تحریک اسلامی کی حکمت عملی میں' معاملات کا تعین کرتے ہوئے' نیکی اور بدی کے اس اصول کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیے۔ پھر سیاسی کام اور غیر سیاسی کام کی بحث بھی سر نہ اٹھا سکے گی' کہ جو کام بھی اللہ اور رسولؐ کی خوشنودی کے لیے ہو گا' وہ قرآن و سنت کے دائرے میں شمار ہو گا اور نیکی ہو گا' چاہے وہ سیاسی ہو یا غیر سیاسی!

جائز اور ناجائز کا معیار : آج امت بڑی حد تک اس حقیقت سے غافل ہو چکی ہے' کہ جتنا بڑا جرم اور گناہ یہ ہے کہ آدمی ناجائز کام کو جائز اور حرام کو حلال قرار دے' اتنا ہی بڑا جرم یہ ہے کہ آدمی جائز کام کو ناجائز اور حلال کو حرام قرار دے۔ اس بات کو ذرا غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہ بحث بہت کی جاتی ہے کہ اللہ نے فلاں فلاں چیزوں کو کیوں حرام کیا' اس کی کیا وجہ تھی؟ مگر جب بغیر کسی دلیل کے یہ کہا جاتا ہے کہ ہمیں یہ یہ کام نہیں کرنے چاہییں' تو پھر یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کام کو کہاں تک منع کیا ہے۔ یہ جاننا نہایت ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے زندگی کا دائرہ بڑا وسیع رکھا ہے۔ اس کے اندر اس نے خود چھوٹ دی ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض چیزوں کو حرام کیا ہے' اور جس کو حرام کیا ہے' تم اس کے خلاف نہ جاؤ۔ بعض چیزوں کی اس نے حدود متعین کر دی ہیں' ان کو مت توڑو اور بعض چیزوں کے لیے وہ خاموش رہا ہے۔ اور وہ خاموش اس لیے نہیں رہا کہ نعوذ باللہ وہ بھول گیا' بلکہ وہ تمھارے اوپر رحمت و شفقت کے لحاظ سے خاموش رہا ہے۔ اس لیے ان چیزوں کے پیچھے مت پڑو۔ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا کہ کسی نے سوال کر کے کسی ایسی چیز کو حرام کر دیا جو امت کے لیے حلال تھی' تو اس کے سر بہت بڑا گناہ ہے۔ اس نے امت کو ہمیشہ کے لیے ایک مشقت میں مبتلا کر دیا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے احکامات بیان کرتے ہوئے اسی بات کو پیش نظر رکھا ہے۔ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا (البقرہ ۲: ۱۶۸)۔ یعنی زمین میں جو حلال اور پاکیزہ چیزیں ہیں وہ سب تمھارے لیے حلال ہیں۔ تم ان کو جس طرح چاہو کھاؤ پیو' تمھیں اس کی اجازت ہے اور حلال و طیب چیزوں کو کوئی حرام نہیں کر سکتا۔ چنانچہ فرمایا: کون ہے جس نے اللہ کی زینت کو حرام کر دیا جو اس نے انسان کے لیے اتاری ہے۔ نبیؐ نے فرمایا کہ جو اللہ نے تمھارے لیے حلال کیا ہے اس کو حرام کیوں کرتے ہو؟ جو طیبات اللہ نے تمھارے لیے حلال کی ہیں ان طیبات کو حرام اور ناجائز مت کرو۔

حرام و حلال کی حدود کا تعین : قرآن نے اس ضمن میں جو پانچواں اصول بیان کیا ہے' وہ دین کا بنیادی اصول ہے۔ وہ یہ ہے کہ مراسم عبودیت میں کچھ چیزیں اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دی ہیں اور ان کی تاکید

فرما دی ہے' اس پر اضافہ صحیح نہیں ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے مثال دی تھی کہ آدمی چھٹی نماز کو لازم کرنا چاہے تو یہ گناہ کا کام ہو گا' حالانکہ نماز ادا کرنا اپنی جگہ خود نیکی کا کام ہے۔ اسی طرح دنیا کے معاملات میں اس نے کچھ چیزوں کو حرام قرار دیا ہے اور دیگر اشیا کے لیے کچھ اصول متعین فرما دیے ہیں کہ ان کی روشنی میں معاملات طے کرو۔ اس کے بعد انسان کو اس نے آزاد چھوڑ دیا اور باقی سب چیزیں حلال کر دیں۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ یہ جانور حلال ہے اور یہ حرام بلکہ اس نے کہا کہ یہ چار چیزیں حرام ہیں اور نبیؐ نے اس میں کچھ اضافہ فرما دیا۔ اس طرح سے اللہ نے حرام و حلال کا دائرہ متعین فرما دیا۔ اس سے یہ بات خود بخود واضح ہو گئی کہ باقی ہر چیز حلال ہے۔ اس کے بعد آدمی کا کام صرف یہ دیکھنا ہے کہ کیا چیز حرام ہے؟ اگر کسی چیز کی ممانعت نہیں ہے تو وہ جائز ہے۔ اس کے اندر کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اس اصول سے زندگی کے مختلف شعبوں میں' مثلاً سیاسی' معاشی اور معاشرتی میدان میں' بہت وسعت پیدا ہو جاتی ہے جس پر ایک حقیقی فلاحی معاشرہ واقعتاً قائم ہو سکتا ہے۔

آج لوگوں کو اگر دین میں تنگی محسوس ہوتی ہے تو اس کی وجہ وہ خود ساختہ پابندیاں ہیں' جو لوگوں نے یہ سوچ کر اپنے اوپر عائد کر رکھی ہیں کہ یہ پابندیاں بھی دین ہیں۔ لوگ اس سے تنگی محسوس کرتے ہیں۔ اگر یہ اصول اپنا لیا جائے کہ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ، (النحل ۱۶:۱۱۶) اور یہ جو تمھاری زبانیں جھوٹے احکام لگایا کرتی ہیں کہ یہ چیز حلال ہے اور وہ حرام' تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھو۔ یعنی جس عالم یا فقیہ نے یہ کہہ دیا کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام' اور آدمی اس کو مان لے کہ یہ حلال و حرام ہے' ایسا نہیں ہے۔ قرآن و سنت سے دلیل ہو تو تب ہی کوئی چیز حلال یا حرام ہو گی۔ قرآن و سنت میں اگر کوئی چیز حرام یا منع نہیں ہے تو کوئی آدمی اسے حرام ثابت نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس سے روکنے کا کسی کو حق نہیں ہے اور وہ چیز دین میں حرام نہیں ہو سکتی۔ اس سے دین' اشاعت دین اور دینی تحریک کے نظام تربیت کے لیے ایک نہایت اہم اصول سامنے آتا ہے۔ جس پر عمل پیرا ہو کر تحریک میں وسعت پیدا ہو گی' دین میں تنگی کا تصور دور ہو گا اور لوگوں کو ساتھ لے کر چلنا آسان ہو گا۔

حقوق کی حیثیت کا تعین: ہر عمل کی ایک حیثیت ہوتی ہے۔ جس حیثیت میں جو عمل مطلوب ہو' اس کی تلافی کسی دوسری حیثیت کے عمل سے نہیں ہو سکتی۔ بحیثیت انسان' بندوں کے حقوق' یہ حقوق کی ایک قسم ہے' جب کہ اللہ کے حقوق' مثلاً نماز' روزہ' زکوٰۃ وغیرہ یہ بالکل دوسری قسم کے حقوق ہیں۔ نماز' روزہ اور زکوٰۃ ادا کرنے والا کوئی انسان' بندوں کے حقوق ادا نہ کرنے کے لیے بہانہ نہیں بنا سکتا۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ "کیونکہ میں نماز پڑھتا ہوں' اس لیے میں جھوٹ بولوں یا کسی کا حق ماروں' اس سے کوئی فرق

نہیں پڑتا"۔ نماز کا مقام اپنی جگہ ہے' اس کا اجر اس کو ملے گا مگر دوسرے حقوق اپنی جگہ ہیں۔ باپ یا بیٹے کی حیثیت سے جو حقوق ہیں' ان کی تلافی نماز سے نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح بیوی کی حیثیت سے یا بحیثیت شوہر جو فرائض عائد ہوتے ہیں' ان کی تلافی بھی ذکر اور نماز سے نہیں ہو سکتی ہے۔ اور حکمران کی حیثیت سے جو فرائض ہیں' ان کی تلافی بھی نماز' روزہ یا خانہ کعبہ میں جا کر رونے دھونے سے نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر حکمران کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ عدل و انصاف کرے' لوگوں کے حقوق ادا کرے اور اللہ کی شریعت کا پابند ہو۔ اس کی تلافی کے لیے یہ عذر کرنا کہ وہ نماز پڑھتا ہے اور تہجد گزار ہے' قابل قبول عذر نہیں ہے۔ اللہ کے ہاں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہو گی۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ اس وقت ہماری بحث آخرت کے اجر و ثواب سے نہیں ہے۔ آخرت میں اللہ تعالیٰ جس کو چاہے قبول کر لے' جس کو چاہے بخش دے اور جس عمل کو چاہے جہاں رکھے۔ البتہ معاشرہ اسی اصول کی بنیاد پر تعمیر ہو گا۔ اسی اصول کے تحت اقوام سے معاملہ کیا جائے گا اور پالیسیاں بنائی جائیں گی' کہ نیکی کیا ہے اور برائی کیا ہے اور کہاں کیا نیکی مطلوب ہے اور کیا نہیں؟ نماز' روزے اور زکوٰۃ جیسے اعمال کی تعریف کر کے انسان اپنی سماجی اور اجتماعی خرابیوں پر پردہ نہیں ڈال سکتا۔

اجتماعی تقویٰ کا تصور : امت نے انفرادی تقویٰ اور اجتماعی تقویٰ کے فرق کو بہت عرصے سے ضائع کر دیا ہے۔ بدقسمتی سے اس فرق کو کافر قوموں نے اپنے ہاں ملحوظ رکھا ہے۔ ان کے ہاں' انفرادی تقویٰ کوئی چیز نہیں ہے۔ کوئی آدمی شراب پیتا ہو یا زنا کرتا ہو' انفرادی تقویٰ میں اس بات کا ان کے ہاں کوئی مقام نہیں ہے۔ لیکن اجتماعی زندگی میں کوئی آدمی اگر جھوٹ بولے' کسی کا حق مارے تو وہ اسے ایک لمحے کے لیے بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ ایک منٹ کے لیے بھی اپنے منصب پر نہیں ٹھیر سکتا۔ وہ کسی فرد کے حق پر دست درازی کرے تو یہ بات اس کی تلافی کے لیے کافی نہیں ہو سکتی کہ یہ بڑا فیاض ہے' اس نے اپنا پیسہ چیریٹی (خدمت خلق کے کام) میں دیا ہے یا اس کی انفرادی زندگی بڑی پاکیزہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب اجتماعی زندگی' اجتماعی اخلاقیات (public morality) یا اجتماعی تقویٰ میں خرابی پیدا ہوتی ہے تو معاشرے میں بگاڑ پھیلتا ہے۔ یہی خرابی کی اصل بنیاد ہے۔

قرآن نے بھی اس کی تصریح بار بار کی ہے۔ مثلاً اجتماعی اخلاق و آداب کے حوالے سے وہ غزوہ تبوک کا ذکر کرتا ہے۔ اس موقع پر دنیا کی دو سب سے بڑی طاقتوں میں سے ایک یعنی روم سے مقابلہ تھا اور دعوت حق کے لیے زندگی اور موت کے فیصلے کی گھڑی تھی۔ یہ موقع عملاً ایمان اور نفاق کی کسوٹی بن گیا تھا۔ اس لیے ہر شخص کو جہاد پر نکلنے کا حکم دیا گیا اور بغیر اجازت کے پیچھے رہنے کی اجازت نہ تھی۔ اس موقع پر جن منافقین نے مختلف حیلے بہانوں سے اجازت مانگی یا جو لوگ بلااجازت پیچھے رہ گئے' ان پر قرآن کا تبصرہ تھا کہ

جو لوگ رسول کے ساتھ کسی اجتماعی کام میں شریک ہوں' اگر وہ اس سے اجازت لیے بغیر چلے جائیں' تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ اجتماعی اخلاق و آداب کی پابندی کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ جو نماز پڑھتے تھے' روزے رکھتے تھے' زکوٰۃ دیتے تھے اور صدقات و خیرات کرتے تھے' ان کے بارے میں قرآن مجید نے اجتماعی نظم و ضبط کی خلاف ورزی کرنے پر کہا کہ ایسے لوگ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والے نہیں ہیں۔ اِنَّمَا یَسْتَاْذِنُکَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (التوبۃ۹ : ۴۵) ایسی درخواستیں تو صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو اللہ اور روز آخر پر ایمان نہیں رکھتے۔

قرآن نے اجتماعی آداب و اخلاق اور انفرادی اعمال و اخلاق میں فرق کیا ہے۔ سورہ نور کے آخر میں قرآن نے اس بات کو دو مرتبہ دہرا کر واضح کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں ایک طرف اس بات کی ضرورت نہیں سمجھی کہ قرآن مجید میں یہ تفصیل بیان کرے کہ نماز کی رکعات کتنی ہیں' بلکہ نماز کے اوقات کی تصریح بھی واضح طور پر نہیں کی' اس کے لیے اسوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے تاویل و تشریح کرنا پڑتی ہے وہاں دوسری طرف آیتوں کی آیتیں اور رکوع کے رکوع' نکاح اور طلاق' بیوی اور شوہر کے تعلقات' وراثت کے احکام اور یتیموں کے ساتھ حسن سلوک پر صرف کیے ہیں۔ یہ تمام احکامات اجتماعی تقویٰ اور اجتماعی اخلاق کے بارے میں ہیں۔ ارشاد ربانی ہے: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِیْلَ لَکُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللّٰہُ لَکُمْ ۚ وَاِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ ۙ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ○ (المجادلۃ ۵۸: ۱۱) اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم سے کہا جائے کہ اپنی مجلسوں میں کشادگی پیدا کرو تو جگہ کشادہ کر دیا کرو' اللہ تمھیں کشادگی بخشے گا۔ اور جب تم سے کہا جائے کہ اٹھ جاؤ تو اٹھ جایا کرو۔ تم میں سے جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں اور جن کو علم بخشا گیا ہے' اللہ ان کو بلند درجے عطا فرمائے گا' اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔ یعنی یہ کام کرنے والے دراصل اہل علم اور اہل ایمان ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے گا' اس لیے کہ یہ اجتماعی آداب کی پابندی کرتے ہیں۔

اگر اٹھنے' بیٹھنے کے اجتماعی تقویٰ کی اتنی اہمیت ہے تو آپ خود ہی دیکھ لیجیے کہ وہ تقویٰ جس کا تعلق انسانوں کے حقوق' خاندان' معاشرت' سیاست اور امور حکومت سے ہے' اس کا کیا مقام ہو گا۔ انفرادی اور اجتماعی تقویٰ کو ایک دوسرے کے بدل کے طور پر پیش کر کے انسان اپنے آپ کو دھوکے میں نہیں ڈال سکتا۔

ہمارے زوال کا اصل سبب یہی ہے کہ ہم اجتماعی تقویٰ کی اہمیت کم کرتے چلے گئے اور انفرادی تقویٰ کی اہمیت بڑھاتے چلے گئے۔ ٹخنوں سے اوپر پاجامہ' داڑھی کا چھوٹا بڑا ہونا اور ایسی ہی چند مختلف چیزیں تقویٰ کا معیار شمار ہونے لگیں۔ لیکن وہ چیزیں جو قرآن و حدیث کے مطابق تقویٰ ہیں' وہ پیچھے چلی گئیں۔ حکمران

آتے رہے' ہم برداشت کرتے رہے۔ فساد پھیلتا رہا' ہم اس کو برداشت کرتے رہے۔ علماے سوء غلط کام کرتے رہے' ہم ان کی پیروی کرتے رہے۔ غلط قسم کے پیر آتے رہے' ہم ان کے پاؤں چومتے رہے۔ اس طرح سے ہم اجتماعی طور پر "اجتماعی تقویٰ" کی نعمت کھوتے چلے گئے۔ یوں ہماری اجتماعی قوت ختم ہوتی چلی گئی اور انجام کار ہم زوال کا شکار ہو گئے۔ آخر کار بیرونی قوتوں نے ہمارے اوپر غلبہ حاصل کر لیا۔ ہم اجتماعی تقویٰ سے دست بردار ہو کر انفرادی تقویٰ کے اندر مشغول ہو گئے۔ ماضی میں بہت سے اکابرین اور قوم کا درد رکھنے والوں نے اس غلط روش کی طرف توجہ دلائی اور اس کا رونا روتے رہے۔ اقبالؒ نے اپنے بے شمار اشعار میں اس طرف توجہ دلائی اور خواب غفلت کی شکار امت کو جھنجھوڑنے اور بیدار کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

مولانا مودودیؒ نے بھی اس کی اہمیت کو محسوس کیا اور اپنی کتاب **تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں** پوری کی پوری اسی مسئلے کی توضیح میں لکھی۔ مگر بدقسمتی سے آج اس شخص سے تعلق رکھنے اور اس کتاب کو پڑھنے والے بھی اس چیز کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ "اجتماعی تقویٰ" دین اور اس تحریک کی بنیادوں میں سے ایک بنیاد ہے۔ اجتماعی تقویٰ کو جو مقام حاصل ہے وہ انفرادی تقویٰ کا نہیں ہے۔ خود مولانا مودودیؒ کا مشہور جملہ ہے کہ اس امت کے اندر تقویٰ کے لحاظ سے انتہائی اعلیٰ کردار کے لوگوں کی کبھی کمی نہیں رہی' لیکن جب تک اجتماعی تقویٰ نہ ہو اور متقی مل کر اجتماعی قوت نہ بنیں' اس وقت تک دین کا غلبہ نہیں ہو سکتا۔ یہ دین کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اہم اصول ہے۔

اہم اور غیر اہم کا مسئلہ : دین کو پیش کرنے میں' اور نیکی اور بدی میں' اہم اور غیر اہم کا فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ آدمی اگر اہم چیزوں کو نظرانداز کر کے غیر اہم چیزوں پر زور دے گا تو وہ دین کے مزاج میں فساد اور انتشار پیدا کرے گا۔ اگر وہ معاشرے کو سامنے نہ رکھ کر دین کو پیش کرے گا تو اس صورت میں بھی معاشرے کے اندر فساد اور انتشار پیدا ہو گا۔

یہ دین کے وہ بنیادی اصول ہیں جن پر پورے دین کی عمارت قائم ہے۔ ان کی حیثیت اساس دین کی سی ہے۔ دین کی حکمت انھی اصولوں میں مضمر ہے۔ معاملات زندگی کا فیصلہ ان اصولوں اور ترجیحات کی روشنی میں کر کے' اللہ کی رضا اور صراط مستقیم پر چلا جا سکتا ہے۔

تحریک اسلامی کے لیے' مختلف حالات میں' کیا حکمت عملی ہو' معاملات کو کیسے چلایا جائے' کیا اہم اور غیر اہم ہو' مضبوط نظم' معیاری تربیت کیسے حاصل ہو' اور موثر فیصلے کیسے کیے جائیں' ان جیسے اہم مسائل کے حل کے لیے یہی وہ بنیادی اصول ہیں جن کی روشنی میں فریضہ اقامت دین موثر حکمت عملی کے ساتھ' بھرپور طریقے سے ادا کیا جا سکتا ہے۔

(تحریر کیسٹ کی مدد سے تیار کی گئی ہے۔ تدوین : سلیم منصور خالد)

اخوان المسلمون

حسن البنّا سے مصطفیٰ مشہور تک

ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی ⁰

(دوسری قسط)

شیخ ہضیبی کے انتقال پر ملال کے بعد اخوان نے باہم غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا کہ تنظیم خلاف قانون ہے تو کیا ہوا؟ نئے مرشد عام کا انتخاب ضروری ہے۔ انھوں نے مکتب الارشاد کے سب سے بزرگ رکن کو مرشد عام بنانے کا فیصلہ کیا اور اس طرح السید عمر تلمسانی تیسرے مرشد عام مقرر ہوئے۔

السید عمر تلمسانی ؒ (۱۹۰۴ - ۱۹۸۶)

سید عمر تلمسانی ۴ نومبر ۱۹۰۴ کو قاہرہ کے علاقے غوریہ میں خوش قدم محلے میں پیدا ہوئے۔ آپ کا آبائی وطن اصلاً الجزائر تھا جہاں ان کے آبا و اجداد قصبہ تلمسان میں رہائش پذیر تھے۔ ۱۸۳۰ میں فرانسیسیوں نے جب اس قصبے پر بھی قبضہ کر لیا تو آپ کے پردادا اپنے اہل و عیال کے ساتھ ہجرت کر کے مصر آ گئے اور تجارت شروع کر دی۔ سید عمر تلمسانی کے ابتدائی ۳ سال ہی گزرے تھے کہ والد نے شہر چھوڑ کر مرکز شبین القناطر کے گاؤں نوئی میں واقع اپنے فارم پر سکونت اختیار کر لی۔ یہیں مدرسہ سیدی علی میں شیخ عبدالعزیز القلماوی اور شیخ احمد الرفاعی جیسے اساتذہ سے آپ نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ عمر کے ۱۰ ویں سال ہی میں اخبار المعظم کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ دادا کی وفات ہوئی تو والد اپنے بچوں کو لے کر ایک بار پھر قاہرہ منتقل ہو گئے۔ وہاں جمعیۃ الخیریہ کے مدرسے میں آپ نے ثانوی تعلیم مکمل کی۔ ۱۹۲۴ میں یہیں سے آپ

⁰ ریڈر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

سے آرٹس میں بی اے کی ڈگری حاصل کی اور یونی ورسٹی لا کالج میں داخل ہو گئے۔ کئی بار امتحان میں ناکام ہوئے۔ ۱۹۳۱ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد عتبہ خضرا میں ایک وکیل ابراہیم بک ذکی کے دفتر میں اپرنٹس شپ سے آپ نے باقاعدہ عملی زندگی شروع کی۔ اس دور کی تکمیل کے بعد شبین القناطر ہی میں اپنا ذاتی دفتر قائم کر کے وکالت کا آغاز کر دیا۔ یہی دور تھا جب ۱۹۳۳ میں آپ نے شیخ حسن البنا سے ملاقات کی اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے باقاعدہ اخوان المسلمون میں شرکت اختیار کی۔

وکالت کا پیشہ جاری رکھتے ہوئے سید عمر تلمسانی نے اخوان المسلمون کی تمام دعوتی اور سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اخوان سے مکمل وابستگی اور وفاداری کو دیکھتے ہوئے شیخ حسن البنا نے آپ کو ایک بار بیت المال کا ناظم بھی مقرر کیا۔ کچھ سالوں کے بعد مرشد عام نے تنظیم کا نائب مرشد عام بننے کی پیش کش بھی کی مگر یہ کہہ کر آپ نے معذرت کر لی کہ میں اس منصب کا اہل نہیں۔ لہٰذا اسے قبول کرنا بددیانتی ہو گی۔ کئی بار اخوان کے امیدوار کی حیثیت سے ملکی انتخابات میں بھی حصہ لیا مگر کامیاب نہ ہو سکے' کیونکہ انتخابات کے طور طریقوں اور انتخاب جیتنے کے ظاہری اور خفیہ ڈھنگ سے بالکل نابلد تھے (السید عمر تلمسانی' یادوں کی امانت' ترجمہ حافظ محمد ادریس' ص ۶۸)۔

سید عمر تلمسانی دوسرے اخوانی کارکنوں کے ساتھ ۱۹۵۴ میں گرفتار کیے گئے۔ ان میں سے بعض شہادت کے مرتبے پر فائز ہوئے۔ آپ کو ۱۵ سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ بعد میں ۲ سال کی مزید توسیع کر دی گئی۔ اس طرح ۱۷ سال تک مسلسل پابہ بجولاں سنت یوسفی ادا کرتے رہے۔ جیل میں کس قدر پامردی و ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا اور ان کی مثالی شریک حیات نے گھر میں بند ہو کر شوہر کے جیتے جی کس طرح بیوگی کے دن کاٹے' اسے خود سید صاحب ہی کی زبانی سنیے:

میں اپنی بیوی کے بارے میں اپنی غیرت کا ایک واقعہ عرض کرتا ہوں جو ابھی مجھے یاد ہے۔ جمال عبدالناصر کی جیلوں میں' میں نے ۱۷ سال کا عرصہ گزارا' اکتوبر ۱۹۵۴ سے لے کر جولائی ۱۹۷۱ تک۔ اس عرصے میں مرحومہ نے ایک مثالی بیوی کا کردار نہایت صبر و استقامت اور نیک روی سے پیش کیا۔ جیل میں مجھے مسلسل ۱۰ سال بیت گئے اور اس عرصے میں میری اہلیہ ایک بار بھی ملاقات کے لیے نہ آئی' کیونکہ مجھے اس بات سے غیرت تھی کہ جیل کے کارندے اور میرے قیدی بھائی میری بیوی کو دیکھ پائیں۔ اخوانی بھائیوں نے مجھ سے اصرار کیا کہ یہ قطع رحمی کی روش ہے اور قابل ملامت ہے۔ ان کے شدید اصرار پر میں نے بیوی کو جیل میں ملاقات کی اجازت دے دی۔ وہ مجھ سے ملنے جیل آئی اور میں نے پر سکون انداز میں اس کا استقبال کیا۔ گویا ہم ایک دوسرے سے ایک دن' یا دن کا کچھ حصہ جدا رہے تھے۔ میری طویل قید اور گھر سے غیر حاضری کے اس دور میں اللہ کی بندی نے کبھی میرے سامنے کوئی پریشانی پیش نہ کی' نہ میرے اہل و اقارب کے لیے کبھی کوئی مسئلہ

کھڑا کیا' اگرچہ کبھی کبھار میری والدہ یا بھائی بہنوں کی طرف سے اس کے ساتھ سختی بھی ہو جاتی (ایضاً ' ص ۵۹)۔

سید عمر تلمسانی نے الوطن العربی کو انٹرویو میں جیل کے ان دلدوز حادثوں میں سے بعض کا ذکر کیا ہے جو ان کے ساتھ روا رکھے گئے۔ مصر میں "مسلم انتہاپسندی" کے بارے میں مرشد عام نے فرمایا:

تم لوگ ان انسانیت سوز مظالم سے کیوں صرف نظر کر لیتے ہو جو ان نوجوانوں کے ساتھ مصری جیلوں میں روا رکھے جاتے ہیں؟ مصر کی جیلوں میں قید اسلامی فکر رکھنے والے نوجوانوں کو ایسی بہیمیت کا نشانہ بنایا جاتا ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے غیر انسانی رویے کے رد عمل کے طور پر اگر یہ نوجوان بھی سخت رویہ اختیار کر لیتے ہیں تو اس پر حکومتی ذرائع ابلاغ وہ شور مچاتے ہیں کہ الامان والحفیظ! مصری جیلوں میں ۱۹۵۴ اور ۱۹۶۵ میں خود ہمارے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا وہ ابلیس لعین کے حاشیہ خیال میں کبھی نہ آیا ہو گا۔ میں تمھیں صرف ایک بات بتاتا ہوں جس سے تم سمجھ جاؤ گے کہ اس دھرتی کے سینے پر کیسے کیسے شنیع واقعات رونما ہوتے رہے ہیں۔ جیل میں ایک مرتبہ میری حقیقی ہمشیرہ کو میری کوٹھڑی کے سامنے لایا گیا۔ میں کوٹھڑی کے اندر بند تھا اور میرے پاؤں بیڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ جیل حکام کے مجمع عام کے سامنے میری بہن کو مادر زاد ننگا کر دیا گیا۔

یہ منظر میری کوٹھری کے عین سامنے کا تھا....! (ہفت روزہ المجتمع 'کویت' شمارہ ۱۲' فروری ۱۹۸۵)۔

جمال عبدالناصر کے بعد محمد انور السادات (۱۹۱۸-۱۹۸۱) کا دور مصر میں آزادی اور جمہوریت کا دور قرار دیا جاتا ہے۔ انھوں نے ناصری دور کی دہشت گردی اور بربریت کا خاتمہ کیا۔ کسی حد تک قانون کی بالادستی قائم کی اور اخوانی رہنماؤں اور دوسرے قیدیوں کو بہ تدریج جیل خانوں سے رہا کیا۔ خارجہ پالیسی میں یہ تبدیلی آئی کہ ابتدا میں روس سے ۱۵ سالہ دوستی کا معاہدہ کیا مگر ۱۹۷۲ میں روس کی منافقانہ سیاست کی وجہ سے امریکہ سے مفاہمت کر لی۔ اسرائیل کی طرف بھی دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور ستمبر ۱۹۷۸ میں امریکہ میں کیمپ ڈیوڈ کے مقام پر اسرائیل کے ساتھ ایک سمجھوتے پر دستخط کر دیے جس سے عالم اسلام میں سادات کی زبردست مخالفت ہوئی۔ مگر اس مفاہمت کے نتیجے میں بہ تدریج ۱۹۸۲ تک ۴۲ ہزار مربع میل پر پھیلے ہوئے جزیرہ نما سینا کو اسرائیل نے مصر کے لیے خالی کر دیا۔ ۱۸ فروری ۱۹۸۰ کو قاہرہ میں اسرائیل کا سفارت خانہ بھی قائم ہو گیا۔

اس دور میں مسلسل اخوان المسلمون پر بندش عائد رہی۔ البتہ اس کا رسالہ الدعوۃ جولائی ۱۹۷۶ سے دوبارہ جاری ہوا' اور دعوتی و دینی سرگرمیاں تنظیم کا نام استعمال کیے بغیر مسلسل انجام دی جاتی رہیں۔ مرشد عام تلمسانی کو غیر سرکاری سطح پر تسلیم بھی کیا گیا اور حکومت نے مختلف مواقع پر انھیں افہام و تفہیم کی دعوت بھی دی۔ سید تلمسانی نے اس پورے دور میں تعلیمی اور تربیتی امور پر توجہ مرکوز رکھی۔ یونی

ورسٹیوں اور کالجوں میں طلبہ الجماعات الاسلامیۃ کے نام سے منظم ہوئے اور طلبہ انتخابات میں اسلام پسند پھر فتح یاب ہونے لگے اور اسلامی قانون کے نفاذ کا غلغلہ بلند ہونے لگا (تفصیل کے لیے دیکھیے: آکسفورڈ انسائیکلوپیڈیا آف دی ماڈرن اسلامک ورلڈ، اشاعت ۱۹۹۵، ج ۲، ص ۳۵۴-۳۵۶)۔

الجماعات الاسلامیۃ دراصل مختلف اسلام پسند تنظیموں کا ایک ڈھیلا ڈھالا وفاق تھا جس نے انور السادات کی لبرل پالیسی سے فائدہ اٹھا کر کام کرنا شروع کیا۔ یہ ساری تنظیمیں شیخ حسن البنا اور ان کی الاخوان المسلمون سے متاثر تھیں مگر اس پر قانونی بندش سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے علیحدہ کام کرنا شروع کیا۔ اس کے رہنما شیخ عمر عبدالرحمٰن تھے جو قصبہ فیوم کے ایک نابینا خطیب اور مبلغ تھے۔ اس وفاق نے پورے ملک میں مساجد کے ذریعے اسلامی شریعت کی تنفیذ کی مہم چلائی۔ قاہرہ، اسکندریہ، پورٹ سعید، علاقہ سویز اور بالائے مصر میں اسیوط، فیوم اور المینا خاص طور پر اس کی سرگرمیوں کے مرکز تھے۔ ان شہروں کی تمام مسجدوں میں درس قرآن کے منظم حلقے قائم کیے گئے اور ضرورت مندوں کو کھانا اور کپڑا بھی فراہم کیا گیا۔ ۷ ویں دھائی میں المینا، فیوم، قنا اور اسوان میں مختلف کالجوں اور یونی ورسٹیوں کی تاسیس سے اس وفاق کو استحکام ملا۔ کیونکہ وہاں کے طلبہ میں اسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ کیمپ ڈیوڈ معاہدے کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے میں بھی ان مسجدوں کے خطبا نے کلیدی کردار ادا کیا۔ ان میں قائد ابراہیم مسجد اسکندریہ کے خطیب شیخ احمد المحلاوی اور قاہرہ کی مسجد النور اور سویز کی مسجد الشہدا کے خطیب شیخ حافظ سلامہ نے اپنی پرجوش اور ولولہ انگیز تقریروں کے ذریعے اسرائیل کے خلاف جہاد و شہادت کا ماحول گرم کیا۔ شیخ عمر عبدالرحمٰن نے بھی اپنی شعلہ بار تنقیدوں کا سلسلہ جاری رکھا یہاں تک کہ ۶ اکتوبر ۱۹۸۱ کو ایک فوجی پریڈ کے درمیان صدر انور السادات کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

الجماعات الاسلامیۃ کے خطیبوں اور رہنماؤں نے ملک میں نفاذ شریعت کی تحریک چلائی۔ انھوں نے شیخ الازہر اور وزارت اوقاف کے ذریعے ملک کی مسجدوں اور مذہبی سرگرمیوں کی حکومتی تنظیم کی بھی مخالفت کی اور مذہب کو حکومتی مشینری کے دائرہ اثر سے آزاد رکھنے اور عام مسلمانوں کی دینی و معاشرتی سرگرمیوں میں مداخلت نہ کرنے پر زور دیا۔ شیخ عبدالرحمٰن نے ایک قدم اور آگے بڑھتے ہوئے سیاسی انتخابات میں حصہ لینے اور ملکی نظام کے جمہوری اداروں کی بقا و ترقی میں شرکت کرنے پر اخوان کو بھی آڑے ہاتھوں لیا۔ شیخ نے جمہوری نظام سے قطع تعلق کرنے کی اپیل کی۔ ۱۹۸۸ کے اواخر میں فیوم، مینا اور اسیوط کے متعدد شہروں میں خون ریز تصادم کے المناک واقعات پیش آئے۔ یہ جھڑپیں شیخ کے متبعین اور مقامی پولیس کے دستوں کے درمیان ہوئیں۔ چنانچہ حکومت نے الجماعات الاسلامیۃ کی تمام سرگرمیوں پر پابندی لگا دی۔ ان کی مساجد مقفل کر دیں اور طلبہ یونین کے تمام انتخابات معطل کر دیے۔ ہزاروں کارکنوں کو قید کر لیا گیا اور گھروں کی تلاشیاں لی گئیں۔ شیخ عمر عبدالرحمٰن بھی گرفتار کر لیے گئے۔ آخر کار

انھیں ملک بدر ہونا پڑا اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں پناہ لینی پڑی (آکسفورڈ انسائیکلوپیڈیا آف دی ماڈرن اسلامک ورلڈ' حوالہ بالا' ج ا' ص ۱۰)۔

صدر انور السادات نے اخوانی رہنماؤں اور کارکنوں کو آغاز حکومت میں کچھ مراعات فراہم کیں مگر اس فراخ دلی اور وسیع النظری کا اصل محرک کیمونسٹوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو متوازن کرنا تھا۔ ایک مخصوص دائرے سے آگے وہ اخوان کی پیش قدمی اور مقبولیت کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وقتاً فوقتاً وہ اخوانی رہنماؤں کو اپنی طاقت اور برتری کا احساس دلاتے رہتے تھے۔ ۱۹۷۹ میں اسماعیلیہ میں "الفکر الاسلامی" کے موضوع پر سیمینار منعقد ہوا تو تمام دینی جماعتوں کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ سید عمر تلمسانی نے شرکت سے معذوری ظاہر کی کیونکہ انھیں یہ گوارا نہ تھا کہ صدر مملکت ان پر اپنی دھونس جمائیں مگر وزیر ثقافت و اطلاعات سید منصور حسن نے اصرار کر کے انھیں راضی کر لیا۔ وہ الحاج مصطفیٰ مشہور اور ڈاکٹر عبدالعظیم المطعنی کے ساتھ سیمینار میں شریک ہوئے۔ اس میں صدر مملکت نے اپنی پوری تقریر میں اخوان ہی کو مختلف بے سروپا اعتراضات و الزامات کا نشانہ بنائے رکھا اور انھیں تخریب کاری اور فرقہ وارانہ فسادات کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ بہرحال سید تلمسانی نے صدر کے تمام الزامات کا ترکی بہ ترکی جواب دیا (السید عمر تلمسانی' یادوں کی امانت' حوالہ بالا' ص ۳۵۷-۳۵۹)۔

۱۹۸۱ میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ فسادات ہوئے تو دوسری سیاسی پارٹیوں کے ساتھ اخوان بھی مبتلائے عذاب ہوئے۔ ۳ ستمبر ۱۹۸۱ کو بڑے پیمانے پر گرفتاریاں عمل میں آئیں اور اخوانی کارکنوں کو جیلوں میں زد و کوب کیا گیا۔ بہرحال یہ ایک دور تھا جو گزر گیا اور اس پورے دور میں اخوان عوامی طاقت بنے رہے۔ سادات کے قتل کے بعد ملک کی زمام کار حسنی مبارک کے ہاتھوں میں آئی۔

صدر حسنی مبارک نے آغاز حکومت میں اچھے اقدامات کیے۔ سیاسی قیدیوں اور نظربندوں کو رہا کیا۔ اخبارات و رسائل کو تنقید کی آزادی دی اور انھیں تاکید کی کہ ممالک عربیہ کے سربراہوں پر دشنام طرازی نہ کریں مگر اخوان المسلمون آج بھی خلاف قانون ہے۔ اس کی سیاسی اور قانونی حیثیت کو حکومت تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ ۱۹۸۶ میں مرشد عام کبر سنی' علالت اور مسلسل نقاہت کے باعث جوار رحمت الٰہی میں چلے گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن!

سید عمر تلمسانی زندگی بھر اسرائیلی ریاست کے قیام کے مخالف رہے۔ انھوں نے کیمپ ڈیوڈ معاہدے کی مخالفت خالص دینی اور اسلامی جذبے سے کی تھی۔ وہ یہودیوں سے دوستی اور تعلقات کو سعی لاحاصل قرار دیتے تھے۔ ان کا نقطہ نظر اس معاملے میں بالکل واضح تھا:

اخوان المسلمون جن کے دل اسلام کی رحمت اور آشتی سے پر ہیں کبھی یہ نہیں کہتے کہ اسرائیل کو سمندر میں غرق کر دیا جائے۔ وہ نہ یہ نعرہ ہی لگاتے ہیں کہ آخری یہودی کو آخری کیمونسٹ کی آنتوں

سے پھانسی پر لٹکایا جائے۔ خوں ریزی اسلام کے مزاج کے منافی ہے۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ یہودی ارض فلسطین پر عام شہریوں کی حیثیت سے رہ سکتے ہیں۔ رہا یہ معاملہ کہ ہم انھیں علاقے پہ حکمرانی اور خوف و ہراس کے ذریعے تسلط کی اجازت دے دیں تو یہ کبھی نہیں ہو گا۔ اقلیت دنیا بھر میں اکثریت کے ساتھ اطمینان و سکون سے زندگی گزارتی ہے۔ مگر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اہل ایمان کے کھلے اور بدترین دشمن' مسلم رعایا پہ عدل و انصاف سے حکومت کریں گے (پھران کو اقلیت میں رہتے ہوئے حکمرانی کا کیا حق حاصل ہے)۔ ان سے انصاف کی توقع عبث اور ناممکن ہے۔

ومكلف الايام ضد طباعها متطلب فى الماء جذوة نار

ترجمہ ۔ جو شخص قوانین طبعی کو ان کے نظام کے خلاف چلانا چاہتا ہے' وہ گویا پانی کے اندر آگ کا انگارا دیکھنے کا خواہش مند ہے (ایضا' ص ۱۱۴)۔

سید عمر تلمسانی کو ام کلثوم کے نغمے بہت پسند تھے۔ وہ ان نعتیہ اشعار سے عشق کی حد تک لگاؤ رکھتے تھے جو امیر الشعراء شوقی [1] (۱۸۶۸۔۱۹۳۲) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں لکھے تھے اور ام کلثوم نے پرسوز آواز میں ان کو گایا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ام کلثوم مرحومہ اپنے فن میں لاجواب تھی مگر افسوس کہ اس نے ظلم اور ظالموں کے قافلے میں شمولیت اختیار کرلی۔ فن کار اگر اپنے فن میں مخلص ہو تو اسے ظلم کا ساتھ کبھی نہیں دینا چاہیے۔ فن تو ادب لطیف اور حس رقیق کا نام ہے اور فن کار اخلاق عالیہ کا نمایندہ ہوتا ہے۔ اسے نرم دلی' رحم' شعور اور ہمدردی کا مظاہرہ کرنا چاہیے نہ کہ وہ سنگ دلی اور ظلم کا مجسمہ بن جائے (السید عمر تلمسانی' یادوں کی امانت' حوالہ بالا' ص ۳۳۴۔۳۳۵)۔ (جاری)

حواشی و تعلیقات

(۱) امیرالشعراء احمد شوقی (۱۸۶۸۔ ۱۹۳۲) کا مولد و مدفن قاہرہ ہے۔ ابتدائی تعلیم کے حصول کے بعد ۱۸۹۱ میں فرانس سے قانون میں گریجویشن کیا۔ مختلف مناصب پر فائز ہوئے۔ آخر میں ۱۹۱۹ میں مصری سینیٹ کے رکن مقرر ہوئے اور تاحیات یہ رکنیت برقرار رہی۔ شعر کی مختلف اصناف مدح' غزل اور مرثیہ نگاری میں شہرت حاصل کی۔ مصر اور عالم اسلام کے سیاسی و سماجی موضوعات پر بھی لکھا۔ شعری مجموعہ الشوقیات ۴ حصوں میں طبع ہو چکا ہے۔ آپ کا ایک دوسرا مجموعہ نظم دول العرب بھی مقبول ہے۔ مصرع کلیوباطرہ' مجنون لیلی' قمبیز' علی بک اور علی بک الکبیر آپ کی ادبی تخلیقات ہیں۔ امیر شکیب ارسلان نے آپ کی سیرت و سوانح پر شوقی او صداقة اربعین سنتہ تحریر کی۔ متعدد ادبا اور شاعروں نے آپ کی ادبی و شعری زندگی پر گراں قدر کتابیں لکھیں جن میں احمد عبدالوہاب ابو العز کی اثنا عشر عاما فی صحبة امیر الشعراء' انطون جمیل کی شوقی' محمد خورشید کی امیر الشعراء شوقی بین العاطفة والتاریخ قابل ذکر ہیں۔

اقبال کا تصور جہاد

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ٥

علامہ اقبالؒ ۱۹۳۳ء میں افغانستان کی ۱۰ روزہ سیاحت (۲۳ اکتوبر تا ۲ نومبر) سے واپس آئے تو کوہ و صحرا کے فطری ماحول میں پرورش پانے والے پرخلوص اور سخت کوش افغانیوں کا آہنگ حیات' ان کے ذہن میں تازہ تھا۔ افغان' ان کے نزدیک ایک بہادر اور شجاع قوم تھی اور اسی لیے "طلسم فرنگ" سے آزاد تھی۔ اس دورے میں انھوں نے بابر' محمود غزنوی' حکیم سنائی اور احمد شاہ ابدالی کے مقبروں کی زیارت بھی کی۔ ایک لذت و کیف سے سرشاری کے ساتھ' مجموعی حیثیت سے' وہ افغانستان کے اندر ایک نئی بیداری کا احساس لے کر واپس ہندستان آئے۔

مثنوی "مسافر" ان کے دورۂ افغانستان کا ماحصل ہے۔ اس کے آخری حصے میں وہ نادر شاہ مرحوم کے جانشین ظاہر شاہ کو "حرف شوق" کا تحفہ پیش کرتے ہیں۔ (ع حرف شوق آوردہ ام از من پذیر)---- یہ "حرف شوق" کیا ہے؟---- ظاہر شاہ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:۔

چوں پدر اہل ہنر را دوست دار — بندۂ صاحب نظر را دوست دار
ہم چوں آں خلد آشیاں بیدار زی — سخت کوش و پر دم و کرار زی
می شناسی معنی کرار چیست؟ — ایں مقامے از مقامات علیؑ است
امتاں را در جہان بے ثبات — نیست ممکن جز بہ کراری حیات
سرگذشت آل عثماں را نگر — از فریب غربیاں خونیں جگر
تا ز کراری نصیبے داشتند — در جہاں دیگر علم افراشتند
مسلم ہندی چرا میداں گذاشت؟ — ہمت او بوے کراری نداشت

(مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق مع مسافر' ص ۸۲)

---

٥ ایسوسی ایٹ پروفیسر' شعبہ اردو' پنجاب یونی ورسٹی' اورینٹل کالج' لاہور

ترجمہ۔ اپنے والد کی طرح اہل دانش و بینش سے دوستی استوار کرو۔ اسی خلد آشیاں کی سی بیدار مغزی' سخت کوشی اور بہادری و جرات مندانہ زندگی بسر کرو۔ جانتے ہو کرار کے معنی کیا ہیں؟ یہ حضرت علیؓ کے مراتب میں سے ایک مرتبہ ہے۔ اس جہان بے ثبات میں کراری (جہاد) کے بغیر زندہ رہنا ممکن نہیں۔ عثمانیوں (ترکوں) کی تاریخ دیکھ لو' جب تک انھوں نے کراری (جہاد) سے سروکار رکھا' دنیا میں ان (کے اقتدار) کا جھنڈا' (ایک نرالی شان سے) لہراتا رہا--- (تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ) ہندی مسلمان کیوں میدان چھوڑ گیا؟ اس لیے کہ اس کے اندر کراری (جہاد) کا حوصلہ باقی نہیں رہا۔

اقبال نے یہاں فقط مسلم ہندی اور آل عثمان (ترکوں) کی مثالیں دی ہیں' مگر ان کی نظر جملہ اقوام عالم کی تاریخ پر محیط تھی۔ ان کے خیال میں آویزش و پیکار ہی حیات و کائنات کا مزاج ہے۔ یہاں ازل سے خیرو شر اور حق و باطل کے درمیان ایک کشاکش پیہم جاری ہے' جس میں افراد و اقوام کی کامیابی ایک خاص انداز و آہنگ حیات (life style) پر منحصر ہے۔ اقبال اسے "کراری" کا نام دیتے ہیں اور ان کی تلقین ہے: ؏ سخت کوش و پردم و کرار زی ـــــ اقبال سمجھتے ہیں کہ افراد ہوں یا اقوام' حیات انسانی کی بقا' آزادی اور اس کا ثبات و استحکام "کراری" کو بروے کار لائے بغیر ممکن نہیں' وہ اسے "سخت کوشی" کا نام بھی دیتے ہیں' اور "قوت شبیری" بھی کہتے ہیں۔ ان کی شاعری میں کہیں یہ "ضرب کلیمی" ہے تو کہیں "چوب کلیم"--- اس کا نام "فقر غیور" بھی ہے اور "جرات رندانہ" ' "خودی" اور "عشق" بھی--- بعض اوقات وہ اسے "دل بیدار" سے تعبیر کرتے ہیں اور کبھی اسے "مجاہدانہ حرارت" سے موسوم کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر وہ اس "ذوق یقین" پر زور دیتے ہیں' جو بسا اوقات بلا شمشیر و تدبیر' بنی نوع انساں کو غلامی کی زنجیروں سے رہائی دلاتا ہے۔

علامہ اقبال کی ابتدائی شاعری میں بھی جہاد کا ایک ملفوف تصور تو یقیناً موجود ہے' مگر جہاد کا وہ حقیقی اسلامی تصور واضح نہیں ہے' جو آگے چل کر ان کے ہاں نمایاں ہوا اور جس میں بنیادی اہمیت قتال کی ہے۔ دراصل اس دور کے مخصوص سیاسی و سماجی حالات کی وجہ سے "جہاد" کی اصطلاح کے بارے میں عام ذہنوں میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پائی جاتی تھیں۔ (آہ! محکومی و تقلید و زوال تحقیق) اور جہاد کو محض شمشیرزنی کے مترادف سمجھ لیا گیا تھا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس صورت حال کی تصویر کشی' ان الفاظ میں کی ہے:

> عموماً لفظ "جہاد" کا ترجمہ انگریزی زبان میں (holy war) "مقدس جنگ" کیا جاتا ہے' اور اس کی تشریح و تفسیر مدت ہاے دراز سے کچھ اس انداز میں کی جاتی رہی ہے کہ اب یہ لفظ "جوش جنوں" کا ہم معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کو سنتے ہی آدمی کی آنکھوں میں کچھ اس طرح کا نقشہ پھرنے لگتا ہے کہ مذہبی دیوانوں کا ایک گروہ ننگی تلواریں ہاتھ میں لیے' ڈاڑھیاں چڑھائے' خونخوار آنکھوں کے ساتھ اللہ اکبر کے نعرے لگاتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ جہاں کسی کافر کو دیکھ پاتا ہے' پکڑ لیتا ہے اور

تلوار اس کی گردن پر رکھ کر کہتا ہے کہ بول لا الہ الا اللہ ورنہ ابھی سر تن سے جدا کر دیتا ہوں۔ ماہرین نے ہماری یہ تصویر بڑی قلم کاریوں کے ساتھ بنائی ہے اور اس کے نیچے موٹے حرفوں میں لکھ دیا ہے کہ: ع بوے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے[۱]

اسلامی جہاد کا حقیقی مفہوم بہت وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ یہ محض قتال و شمشیر زنی تک محدود نہیں' بلکہ فلاح انسانیت کے لیے جملہ صلاحیتوں اور طاقتوں کے استعمال کا نام "جہاد" ہے۔ انسانی اصلاح اور تعمیر کے لیے ہر طرح اور ہر سطح کی کوشش و کاوش جہاد ہی کے زمرے میں شمار ہو گی۔ قوت و طاقت کے استعمال اور مال و متاع کی قربانی کے علاوہ: "زبان و قلم کے زور سے لوگوں کے نقطہ نظر کو بدلنا' اور ان کے اندر ذہنی انقلاب پیدا کرنا بھی جہاد ہے" (سید ابوالاعلیٰ مودودی: اسلامی نظام زندگی' ص ۳۰۰)۔

ابتدائی زمانے میں' ذہنی انقلاب کے سلسلے میں اقبال کی نظم "عبدالقادر کے نام" (۱۹۰۸)' (بانگ درا' ص ۱۳۲) قابل ذکر ہے' جو بہ قول غلام رسول مہر "قوم کی عملی خدمت کے لیے کمربستہ ہونے کا یہ پہلا اعلان" تھا (مطالب بانگ درا' شیخ غلام علی' لاہور' ۱۹۷۶' ص ۱۵۶)۔ جس میں نوجوان شاعر' افق خاور پر چھائی ہوئی ظلمت کو اجالے میں بدلنے اور بزم گو عالم میں شمع کی سی زندگی کے ساتھ "خود جلیں' دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں" کا عزم صمیم ظاہر کرتا ہے۔ وہ "اپنے درماندہ کارواں" کو' منزل مقصود تک پہنچانے کے والہانہ جذبے سے سرشار ہے (غزل بہ عنوان: مارچ ۱۹۰۷)۔ مابعد کی بیشتر منظومات میں (بلاد اسلامیہ' ترانہ ملی' شکوہ' خطاب بہ جوانان اسلام' شمع اور شاعر' حضور رسالت مآبؐ میں' جواب شکوہ' فاطمہ بنت عبداللہ' دعا' جنگ یرموک کا ایک واقعہ' خضر راہ' طلوع اسلام) ملت اسلامیہ کی سیکڑوں سالہ جہادی سرگرمیوں اور مجاہدین اسلام کے فاتحانہ کارناموں کی مدح و ستایش ملتی ہے۔ اقبال کے نزدیک طرابلس کے شہیدوں کا لہو' ملت کے لیے حیات نو کی علامت ہے اور فاطمہ بنت عبداللہ کو وہ "آبروے امت مرحوم" قرار دیتے ہیں۔ وہ اس عرب لڑکی کی جرات و جسارت' شوق شہادت اور ایک والہانہ جذبہ جہاد پر خوش گوار تعجب کا اظہار کرتے ہیں:۔

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی (بانگ درا' ص ۲۱۴)

اسی زمانے کی نظم "شمع اور شاعر" (۱۹۱۲) میں اقبال' قدرے واشگاف لہجے میں کہتے ہیں:۔

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیراللہ کو
خوف باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو (ایضاً' ص ۱۹۲)

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر' بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے (ایضاً' ص ۱۹۳)

اسرار خودی (۱۹۱۵) اور رموز بے خودی (۱۹۱۸) میں ملت اور افراد ملت کو ان کی اصلیت' جوہر و جذبے اور ان کے اندر پوشیدہ شوکت طوفاں سے آگاہ کرنے کی سعی ہے--- بال جبریل کی شاعری میں جذبہ خودی' جذبہ عشق میں ڈھل جاتا ہے' پھر خودی اور عشق کے امتزاج سے ابراہیمؑ خلیل اللہ' موسیٰؑ کلیم اللہ' حیدر کرارؓ اور شبیرؓ یا حسینؓ جذبہ جہاد کے استعارے بن کر سامنے آتے ہیں' اور اقبال کردار قاہرانہ' متاع تیموری' جرات رندانہ اور حملہ ترکانہ [ترک کی طرح حملہ] پر زور دیتے ہیں۔ بال جبریل کی غزلوں میں:

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستان حرم (ص ۶۳)
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد (ص ۷۰)
گزر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوب کلیم (ص ۶۰)
شمشیر و سناں اول' طاؤس و رباب آخر (ص ۵۴)
کوہ شگاف تیری ضرب' تجھ سے کشاد شرق و غرب (ص ۲۹)
حقیقت ابدی ہے' مقام شبیری (ص ۷۳)
میراث مسلمانی' سرمایہ شبیری (ص ۱۶۰)
صلہ شہید کیا ہے' تب و تاب جاودانہ (ص ۱۵)

جیسے مصرعے اقبال کے تصور جہاد کے سلسلے میں معنی خیز ہیں' اور اس حقیقت کی توثیق بھی کرتے ہیں کہ اقبال ہی کے بہ قول: "اسلام' جہاد فی سبیل اللہ کو حیات کے لیے ضروری تصور کرتا ہے---" (اقبال نامہ' اول' مرتب: شیخ عطاء اللہ۔ شیخ محمد اشرف' لاہور' ۱۹۴۴' ص ۳۶)۔ پھر "طارق کی دعا" میں' جو اقبال کے سفر اندلس (۱۹۳۳) کے قریبی زمانے کی یادگار ہے' تصور جہاد کا ایک پورا منظر نامہ مرتب ہوتا ہے۔ یہاں اقبال نے جس لذت آشنائی اور سرور کا ذکر کیا ہے (دوعالم سے کرتی ہے بے گانہ دل کو/ عجب چیز ہے لذت آشنائی' بال جبریل' ص ۱۰۵ اور: سرور جو حق و باطل کی کارزار میں ہے/ تو حرب و ضرب سے بے گانہ ہو تو کیا کہیے' ضرب کلیم' ص ۵۳) غالباً اس کے پس منظر میں وہ حدیث نبویؐ ہے' جس میں آپؐ نے جہاد اور شہادت کے لطف و لذت کا احساس دلانے کے لیے فرمایا: وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ لَوَدِدْتُ اَنِّیْ اَغْزُوْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَاُقْتَلُ' ثُمَّ اَغْزُوْ' فَاُقْتَلُ ثُمَّ اَغْزُوْ فَاُقْتَلُ' اس ذات کی قسم جس کے قبضہ اختیار میں محمدؐ کی جان ہے' میری خواہش تو یہ ہے کہ میں اللہ کی راہ میں لڑوں اور مارا جاؤں' پھر لڑوں اور مارا جاؤں' پھر لڑوں اور مارا جاؤں (بخاری' مسلم بہ حوالہ: جہاد اسلامی' خلیل احمد حامدی' ۱۹۹۴' ص ۲۴)۔

یوں جہاد فی سبیل اللہ کا حقیقی تصور' اقبال کی شاعری میں پوری طرح واضح نظر آتا ہے۔ چنانچہ جب وہ کہتے ہیں:

امتاں را در جہان بے ثبات — نیست ممکن جز بہ کراری حیات

(مثنوی مذکورہ' ص ۸۲)

یا: ع

زندہ حق از قوت شبیری است (اسرار و رموز' ص ۱۱۰)

تو یہاں "کراری" اور "شبیری" کے الفاظ واضح طور پر جہاد فی سبیل اللہ کے مترادفات میں سے ہیں۔

علامہ اقبال بجا طور پر سمجھتے تھے کہ گزشتہ ۱۳' ۱۴ سو برسوں میں اسلام کی قوت اور امت مسلمہ کی بقا کا انحصار جہاد فی سبیل اللہ پر رہا ہے۔ برعظیم پر انگریزی استعمار کے تسلط' غلامانہ ذہنیت' سیاسی شکست خوردگی اور مغربی فکر و فلسفے سے مرعوبیت نے تاویلات کے ذریعے تصور جہاد کو مسخ کرنے کی کوشش کی۔ اقبال نے اس معذرت خواہانہ طرز فکر کو قطعی رد کر دیا جس کا بیج' سرسید احمد خاں نے تعلیم یافتہ ذہنوں میں بویا تھا اور قادیانی مذہب انگریزی استعمار سے وفاداری نبھاتے ہوئے پوری تندہی سے اس کی آبیاری کر رہا تھا۔ علامہ اقبال بہ خوبی سمجھتے تھے کہ نفی جہاد کی اس مہم کے پس پردہ کون سی استعماری طاقت کام کر رہی ہے۔ نظم "جہاد" (ضرب کلیم' ص ۲۸) میں انھوں نے صورت حال کا پرلطف تجزیہ کیا ہے:

فتویٰ ہے شیخ کا' یہ زمانہ قلم کا ہے
دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر

"جہاد" ' مرزا غلام احمد قادیانی کی ایک نظم: "دینی جہاد کی ممانعت کا فتویٰ" (۱۹۳۵) کا جواب ہے۔[۲] پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے خیال میں' اقبال اس نظم میں تنسیخ جہاد کا اعلان کرنے والی قادیانی جماعت سے مخاطب ہیں (ضرب کلیم مع شرح' اعتقاد پبلشنگ ہاؤس' دہلی' ۱۹۹۱' ص ۹۹)۔ اقبال جناب شیخ سے کہتے ہیں کہ آپ کے وعظ و نصیحت کا اصل مستحق یورپ ہے' جس نے حفظ باطل کے لیے نوع بہ نوع اور جدید ترین اسلحے کے انبار جمع کر رکھے ہیں ـــــ اگر آپ امن کے خواہاں ہیں تو ذرا یورپ کا محاسبہ بھی کیجیے۔ "مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر" (ضرب کلیم' ص ۲۸)۔

احادیث نبویؐ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ تمام عبادات سے افضل ہے۔ ایک دن کا جہاد' ہزار دنوں کی عبادت سے بہتر ہے' بلکہ جہاد کے لیے نکلنے کو صحبت نبویؐ میں رہنے پر ترجیح دی گئی ہے (جہاد اسلامی' ص ۲۲' ۲۷' ۲۸)۔ جہاد کی اسی فضیلت کے پیش نظر' علامہ اقبال نے تاریخ اسلام کے ان اکابر و شخصیات کی مدح و ستائش کی ہے' جن کا شمار زمرۂ مجاہدین و شہدا میں ہوتا ہے (جملہ صحابہ کرامؓ اور بعض

حکمران' جیسے: سلطان صلاح الدین ایوبی' سلطان محمد فاتح' ٹیپو سلطان' احمد شاہ ابدالی اور بعض مصلحین و مجاہدین' جیسے: سید احمد بریلوی' شاہ اسماعیل شہید وغیرہ)۔ علامہ اقبال' حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی دور اندیشی کی تعریف کرتے ہیں' جن کی ذات تحریک مجاہدین کی موید تھی' اور جن کی دعوت و تحریک پر احمد شاہ ابدالی نے ہندی مسلمانوں کو مرہٹوں کے تسلط سے بچانے میں کلیدی کردار ادا کیا (اقبال کے حضور' مرتب: نذیر نیازی' اقبال اکادمی پاکستان' کراچی' ۱۹۷۱' ص ۳۲۱)۔

اقبال کے نزدیک جہاد کی دو سطحیں ہیں' ایک ظاہری' دوسری باطنی۔ ظاہری سطح پر جہاد میں قوت و توانائی کے ساتھ جنگی اسلحہ اور دیگر اسباب قتال کی فراہمی ضروری ہے۔ فکر اقبال میں بہ حیثیت مجموعی بھی قوت و طاقت' ایک اہم قدر ہے: ع

کہ سر بہ سجدہ ہیں' قوت کے سامنے افلاک (ضرب کلیم' ص ۱۲۳)

بازو ہے قوی جس کا' وہ عشق ید اللّٰہی (ایضاً' ص ۱۷۴)

اقبال کہتے ہیں کہ جس قوم میں طاقت و توانائی مفقود ہو جائے' جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد' مسلمانوں میں ہو گئی' تو پھر اس قوم کا نکتہ نگاہ بدل جایا کرتا ہے (اقبال نامہ' اول' ص ۴۵)۔

اقبال نے طاقت و توانائی اور قوت کے حصول پر طرح طرح سے زور دیا ہے۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں' مگر اقبال کا ہر ذی ہوش قاری تصدیق کرے گا کہ کلام اقبال میں تیزی و تندی' سرکشی و بے باکی' عزم بلند' جرات رندانہ' کردار قاہرانہ' دبدبہ نادر' شکوہ سنجر' شوکت تیموری' متاع تیموری اور مردان جفاکش کا ذکر بکثرت ملتا ہے اور یہ ذکر بالعموم پسندیدگی کے انداز میں ہے۔ اس سے ان کے ہاں ایک ایسے مجاہد کا کردار ابھرتا ہے جو تمام تر فقر و درویشی کے باوصف' ہمیشہ مستعد و متحرک رہتا ہے' لہو گرم رکھنے کے لیے پلٹنے' جھپٹنے اور جھپٹ کر پلٹنے کو اپنا شعار بناتا ہے' اس کی رفعت پسندی تلاش منزل کے لیے آسمان کی بلندیوں کا رخ کرتی ہے: ع

یہاں فقط ہو شاہیں کے لیے ہے کلاہ (بال جبریل' ص ۳۳۸)

مختصر یہ کہ اقبال کا مجاہدانہ کردار تحرک اور جہد مسلسل کا نمایندہ اور قوت و طاقت کا خواہاں ہے۔

اقبال مروجہ تصوف سے مایوس تھے کیوں کہ صوفیا کے ہاں "مجاہدانہ حرارت" ہی عنقا تھی اور انھوں نے "جنگ دست بدست" کے معرکوں سے گریزپا ہو کر' "خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات" کو نجات کے لیے کافی سمجھ لیا تھا۔ معروف ادبی شخصیت مولانا صلاح الدین احمد مرحوم نے کلام اقبال کے مطالعے سے ایک دلچسپ نکتہ اخذ کیا ہے' وہ لکھتے ہیں:

کلام اقبال کا قریباً ہر شعر اس کے پیام حرکت و حرارت کے کسی نہ کسی پہلو کا حامل اور امین ہے۔ اقبال نے اپنی زندگی میں کم و بیش ۲۵ ہزار اشعار کہے ہیں۔ کم از کم ۲۰ ہزار اشعار ایسے ضرور نکلیں گے جو اس کے کلام میں حرکت و حرارت کی صدہا کیفیات کے آئینہ دار ہوں گے (تصورات اقبال' مرتب: معزالدین احمد' ایجوکیشنل بک ہاؤس' علی گڑھ' ۱۹۷۴' ص ۱۹۶)۔

حرکت و تحرک کی مناسبت سے یہاں پروفیسر حمید احمد خاں کی ایک روایت کا ذکر مناسب ہو گا۔ علامہ اقبال سے ۱۰ نومبر ۱۹۳۷ کی ایک ملاقات کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ تصوف کا ذکر آیا تو حضرت علامہ نے مرزا غالب کے سکونی (static) تصوف کے مقابلے میں بیدل کے حرکی (dynamic) تصوف کی تعریف کی [علامہ نے گفتگو میں یہی انگریزی لفظ استعمال کیے تھے] کیوں کہ ان کے بہ قول: "بیدل کے کلام میں خصوصیت سے حرکت پر زور ہے"۔ اس گفتگو میں اقبال نے ایک اور پتے کی بات کہی' فرمایا: "نقش بندی سلسلے اور حضرت مجدد الف ثانی سے بیدل کی عقیدت کی بنیاد یہی ہے۔ نقش بندی مسلک حرکت اور رجائیت پر مبنی ہے" (ڈاکٹر صاحب نے "dynamic and optimistic" فرمایا)۔ مگر چشتی مسلک میں قنوطیت اور سکون کی جھلک نظر آتی ہے (یہاں ڈاکٹر صاحب نے "pessimistic and static" کے الفاظ استعمال کیے)۔ اسی وجہ سے چشتیہ سلسلے کا حلقہ ارادت زیادہ تر ہندستان تک محدود ہے' مگر ہندستان سے باہر' افغانستان' بخارا' ترکی وغیرہ میں نقش بندی مسلک کا زور ہے" (اقبال کی شخصیت اور شاعری: مجلس ترقی ادب' لاہور' ۱۹۸۳' ص ۵۴' ۵۵)۔

یہاں افغانستان' ترکی اور بخارا کا ذکر آیا تو یہ بتانا مناسب ہو گا کہ اقبال افغانوں اور ترکوں کے عسکری مزاج کے ہمیشہ مداح رہے۔ بہ نسبت دوسری اسلامی قوموں کے' اقبال افغانوں اور ترکوں سے زیادہ توقعات رکھتے تھے' غالباً اس لیے کہ دونوں قوموں نے بیرونی تسلط کے خلاف ہمیشہ مزاحمت کی اور اپنی مجاہدانہ افتاد طبع کی وجہ سے' کسی استعماری طاقت کی مستقل غلامی پر رضامند نہیں ہوئے۔ جہاد افغانستان (۱۹۷۹-۱۹۸۹) تو ایسا کرشمہ ساز ثابت ہوا کہ بخارا و سمرقند کی غلامی کی زنجیریں بھی ٹوٹ گریں--- عہد اقبال میں وسطی ایشیا کے مسلم اکثریتی علاقے اشتراکی سامراج کی گرفت میں تھے اور غازی انور پاشا اور ان کے رفقا' ترکی سے مل کر مقامی مجاہدین آزادی کی مزاحمتی کارروائیوں میں جا شامل ہوئے۔ اقبال نے انور پاشا کی جہادی سرگرمیوں کو سراہا۔ وہ پرامید تھے کہ یہ سرگرمیاں نتیجہ خیز ہوں گی (تفصیل کے لیے دیکھیے: "چودھری محمد حسین اور اقبال" (روابط) از ثاقف نفیس' تحقیقی مقالہ ایم اے اردو' پنجاب یونی ورسٹی' لاہور' ۱۹۸۴)۔ اسی طرح ۱۹۳۰-۱۹۳۲ کے زمانے میں چینی ترکستان کے مسلمانوں نے جنگ آزادی شروع کر رکھی تھی۔ برعظیم کے مسلمانوں کو قدرتاً' اس سے دلچسپی اور ہمدردی تھی۔ پروفیسر حمید احمد خاں کا بیان ہے کہ علامہ اقبال کو اس

سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ وہ اس تحریک سے کسی عظیم تر انقلاب ("آشوب ہلاکوے' ہنگامہ چنگیزے") کی توقعات قائم کر رہے تھے (اقبال کی شخصیت اور شاعری' ص ۳۷)۔ ایک اور جگہ انھوں نے الجزائر کے عبدالکریم ریفی کی جہادی سرگرمیوں کی تائید و تحسین کی ہے۔

اس تفصیل سے مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ اقبال کے فکر اور ان کی شاعری کی اٹھان و نہاد مجاہدانہ ہے اور ان کے نزدیک مسلمانوں کی حیات نو اور امت کی نشات ثانیہ کا راز اسی جہادی قوت و طاقت میں مضمر ہے۔ جہاد کے لیے قوت و طاقت کی بہ ہر قیمت فراہمی عین تقاضائے دین ہے۔ تلواروں کے سائے تلے زندگی کی نشوونما کا تصور (تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں' بانگ درا ' ص ۱۵۹) اقبال نے غالباً رسول اکرمؐ کے اس فرمان سے اخذ کیا ہے: اِنَّ اَبْوَابَ الْجَنَّةِ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوْفِ (بہ حوالہ: جہاد اسلامی' ص ۲۸)۔ ایک اعتبار سے "عصا"' "ضرب کلیمی"' "چوب کلیم" اور "زور حیدری" اسی تلوار کے مترادفات ہیں۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اقبال نے شمشیر زن مجاہد کے لیے خطر پسندی اور سخت کوشی کو ضروری قرار دیا ہے۔ سطور بالا میں اقبال کے جس مجاہدانہ کردار کا ذکر آیا ہے' اس کی وضاحت اقبال کے بعض شعروں اور مصرعوں سے ہوتی ہے' مثلاً: ع

سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں (بال جبریل ' ص ۱۲۰)
مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر (ضرب کلیم ' ص ۳۳)
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے (ایضاً ' ص ۵۸)
جوے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی (بانگ درا ' ص ۲۵۹)

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد (بال جبریل ' ص ۸)

باطل کے خلاف معرکہ آرائی کے لیے سب سے بڑا اور کارگر ہتھیار تلوار ہے' جس کے بغیر کوئی مہم سر نہیں ہو سکتی:۔

ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے
بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تخت جم و کے (ضرب کلیم ' ص ۱۲۷)

اقبال کے تصور جہاد میں ظاہری قوت و طاقت کا استعمال ضروری تو ہے' مگر جہاد کی باطنی سطح بھی قابل توجہ ہے اور یہ زیادہ بامعنی ہے۔ مجاہد کی حقیقی قوت کا سرچشمہ روح جہاد ہے۔ اقبال کے ہاں تلوار محض ایک آلہ ضرب کا نام نہیں' بلکہ اس جذبے' رویے اور روحانی قوت کا نام ہے جسے اقبال کبھی "فقر" کا نام دیتے

ہیں' کبھی "خودی" کا اور کبھی "عشق" کا--- یعنی جہاد میں اصل چیز وہ باطنی کیفیت یا روح جہاد ہے جس سے سرشار ہو کر مردان غازی: ؎ ٹل نہ سکتے تھے' اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے (بانگ درا' ص ۱۶۴)' اور: ؎ تیغ کیا چیز ہے' ہم توپ سے بھی لڑ جاتے تھے (ایضاً' ص ۱۶۵) کا مجسم نمونہ بن جاتے ہیں۔ فی الحقیقت مرد غازی' شمشیر و سناں' تیغ و تفنگ یا دوسرے خارجی وسائل پر بھروسا نہیں کرتا (مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی' بال جبریل' ص ۳۵) اس کی اصل قوت اس کا جذبہ ایمانی ہے اور اسی بنا پر وہ کمال خود اعتمادی کے ساتھ باطل سے معرکہ آزما ہوتا ہے۔ (اللہ کو پامردی مومن پر بھروسا' ارمغان حجاز' ص ۴۱)۔ اسے اعتماد ہے کہ وہ تاریخ کا رخ بھی بدل سکتا ہے اور قوموں کی تقدیر بھی۔ کلمہ لا الٰہ الا اللہ' اقبال کے نزدیک ایک تیغ بے زنہار ہے اور: ؎ لا الٰہ ضرب است و ضرب کاری است (ایضاً' ص ۱۲)۔ یہی کلمہ' قلب مومن کو "فقر" سے آشنا کرتا ہے (؎ اللہ کرے تجھ کو عطا فقر کی تلوار' ضرب کلیم' ص ۲۷)۔ اور اس کے نتیجے میں: ؎

قبضے میں یہ تلوار بھی آ جائے تو مومن
یا خالد جانباز ہے یا حیدر کرار (ایضاً' ص ۲۲)

قابل ذکر بات یہ ہے کہ اقبال کے ہاں "فقر" کی جس قدر تلقین ملتی ہے' وہ "خودی" اور "عشق" سے کہیں زیادہ ہے' اور عبادات ظاہری سے تو یقیناً زیادہ ہے۔ ان کے نزدیک "فقر" پورے دین پر محیط ہے' بلکہ یہ اسلام ہی کا دوسرا نام ہے: ؎

لفظ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر
دوسرا نام اسی دین کا ہے فقر غیور (ایضاً' ص ۳۱)

اقبال کا تصور فقر انسان کو تحرک' قوت اور جرات رندانہ عطا کرتا ہے۔ یہ ایک جہادی رویہ ہے جس سے غفلت کا نتیجہ غلامی ہے: ؎

کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو
کہ تجھ سے ہو نہ سکی' فقر کی نگہبانی (ایضاً' ص ۳۲)

اقبال نے کیفیت فقر کو اسوۂ رسولؐ کے حوالے سے بھی واضح کیا ہے--- ان کے نزدیک فقر "متاع مصطفیٰ" ہے--- (؎ ما امینیم' ایں متاع مصطفیٰ است' مثنوی پس چہ باید کرد' ص ۴۶)۔ آنحضورؐ کے لیے "فقر" باعث فخر تھا۔ آپؐ کے ہاں کئی کئی دن چولھا تک گرم نہیں ہوتا تھا۔ کہیں سے ہدیہ آتا' آپؐ فوراً تقسیم کر دیتے۔ جنگ خندق کے موقع پر' آپؐ نے اپنے رفقا کے (ایک ایک پتھر کے) مقابلے میں پیٹ پر دو پتھر باندھ رکھے تھے۔ آپؐ نے جاہ و منصب اور مال و منال کی ہر پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ بلاشبہ آپؐ

یوثرون علیٰ انفسھم کا بہترین نمونہ تھے۔ اقبال نے اسے "حجازی فقر" کہا ہے' جس کا نتیجہ یہ ہے کہ:۔

اس فقر سے آدمی میں پیدا اللہ کی شان بے نیازی
یہ فقر غیور جس نے پایا بے تیغ و سناں ہے مرد غازی
مومن کی اسی میں ہے امیری اللہ سے مانگ یہ فقیری

(ضرب کلیم' ص ۸۹)

اقبال کا فقیر یا قلندر' فی الاصل بہت بڑا مجاہد ہے۔ "مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" میں اقبال کہتے ہیں کہ جب مجاہد اپنے "فقر" کو بروئے کار لاتا ہے تو اس کی ہیبت سے بحرو بر اور چاند اور سورج بھی لرزتے ہیں۔ اس فقر کی قوت کبھی تو بدر و حنین میں ظاہر ہوتی ہے اور کبھی اس کی جھلک تکبیر حسینؓ میں نظر آتی ہے (ص ۲۲)۔ پھر اقبال اس قوم پر افسوس کرتے ہیں جس نے میر و سلطاں تو پیدا کیے مگر کوئی درویش پیدا نہیں کیا(مع: میرو سلطاں زاد و درویشے نزاد' ایضاً' ص ۲۳)۔ ان کے نزدیک زوال مسلم کا ایک سبب فقر سے محرومی ہے:۔

یہ فقر مرد مسلماں نے کھو دیا جب سے
رہی نہ دولت سلمانیؓ و سلیمانی (ضرب کلیم' ص ۵۱)

نہ ایراں میں رہے۔ باقی نہ توراں میں
وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاک قیصر و کسریٰ (بال جبریل' ص ۶۳)

اقبال نے "فقر" کی تجسیم جن شخصیات میں کی' ان میں نبی آخرالزماںؐ کے علاوہ حضرت خالدؓ بن ولید' حضرت علیؓ اور حضرت شبیرؓ شامل ہیں۔ ان درویشان باصفا کو اللہ نے نان جویں کے ساتھ "بازوے حیدر" سے بھی نوازا تھا۔ بلاشبہ یہ اصحاب' زہد و ریاضت اور فقرو غنا کا نمونہ تھے اور اسی لیے جہاد اسلامی کے مثالی پیکر بھی۔ اقبال نے مثنویؒ مسافر" میں ایک حدیث نبویؐ کا حوالہ دیا ہے (ص ۷۷) جس میں آپؐ نے فرمایا کہ میرے دو پیراہن ہیں: ایک فقر' دوسرا جہاد--- گویا' تکمیل شخصیت کے لیے فقرو جہاد لازم و ملزوم ہیں۔

اوپر بھی اشارہ کیا گیا کہ اقبال کے ہاں جہاد کا مفہوم' محض شمشیرزنی' اظہار قوت' معرکہ آرائی یا قتال تک محدود نہیں--- اصل مطلوب جہادی روح یا جہادی رویہ ہے چنانچہ قوت و طاقت اور معرکہ آرائی کے ساتھ علم و عقل اور حکمت و دانش کا حصول بھی "روح جہاد" کا ضروری حصہ ہے۔ اقبال کا مجاہدانہ کردار' "نہایت اندیشہ و کمال جنوں" کا امتزاج ہے اور "عجم کے حسن طبیعت" اور "عرب کے سوز دروں" کا نمایندہ۔

اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عصر حاضر کے تناظر میں اقبال کے تصور جہاد کی کیا معنویت ہے؟

بیسویں صدی آخری دموں پر ہے اور اکیسویں صدی کی آمد کے ساتھ اقوام عالم میں ایک نئے عالمی نظام کی ضرورت کا احساس بڑھ گیا ہے۔ اقبال کے زمانے میں، مغرب کی بڑی طاقتوں کا استعمارانہ تسلط برقرار و باقی تھا' چنانچہ اقبال شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ: "نظام عالم ایک نئی تشکیل کا محتاج ہے" (مکتوب بنام سید سلیمان ندوی' اقبال نامہ' اول' ص ۱۸۱)۔ مگر اس تشکیل کے لیے مغرب کی فراہم کردہ بنیادیں بودی ثابت ہو چکی تھیں' بہ قول اقبال:

جہان نو ہو رہا ہے پیدا' وہ عالم پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے' قمار خانہ (بال جبریل' ص ۱۳۰)

اقبال کا تصور جہاد' جہان نو کی تشکیل کے لیے اخوت و مساوات اور عدل و انصاف کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ کیونکہ مطلوبہ جہاد کا مقصد' دنیا میں ایک عادلانہ نظام زندگی کے قیام و استحکام کے سوا کچھ نہیں۔

اقبال کی وفات پر ۶۱ برس گزر چکے ہیں' مگر ان کے تصور جہاد کی معنویت آج بھی برقرار ہے۔ واضح رہے کہ اقبال نے جہاد کا جو تصور پیش کیا ہے' اس میں 'جہاد فی سبیل اللہ کے حوالے ہی سے معنویت پیدا ہوتی ہے۔ اقبال نے جہاد کو اسلام کی روح اور سنت پیغمبری قرار دیا ہے (جنگ مومن سنت پیغمبری' است' جاوید نامہ' ص ۱۸۵)۔ ان کے نزدیک جہاد کا مقصد نہ تو حصول دولت و غنائم ہے اور نہ شہرت و ناموری۔ مجاہد نہ تو فسادیوں کی طرح کمزوروں پر دھونس جماتا ہے' نہ وہ استعماریوں کی مانند ملک گیری کی ہوا و ہوس میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس کی ساری تگ و دو مفسدوں اور ظالموں کی بیخ کنی' باطل و بدی کے خلاف جہاد پیہم اور کمزوروں اور مظلوموں کی مدد و اعانت کے لیے ہوتی ہے۔ گویا' جہاد سے مقاصد دین ہی کی تکمیل ہوتی ہے۔

قوت و طاقت اور دین کا باہمی ربط کیا ہے؟ ضرب کلیم کی نظم "قوت اور دین" میں اقبال نے اس تعلق کو بڑی عمدگی سے واضح کیا ہے--- وہ کہتے ہیں کہ قوت محض یا اندھی قوت انتہائی خطرناک ہے' کیوں کہ اس کا مقصد جاہ و اقتدار کا حصول اور نفسانی اغراض کی تکمیل ہے۔ اس نے اسکندر و چنگیز کی صورت بارہا دامن انسانیت تار تار کیا ہے' اور اس وحشیانہ قوت کے سامنے عقل و نظر اور علم و ہنر بھی بے بس ہو جاتے ہیں' ہاں اگر اسے دینی حدود کا پابند کر لیا جائے تو پھر یہی جہادی قوت ہر طرح کے فتنہ و فساد کا علاج بن جاتی ہے بلکہ: مع: ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک (ضرب کلیم' ص ۲۹)۔ بیسویں صدی کی ۲ عظیم جنگوں کی ہلاکت خیزیوں کا تصور کیجیے اور دنیا کے مختلف خطوں میں مظلومین و مستضعفین کے خلاف ظالموں اور مفسدوں کی حالیہ چنگیزیت اور ستم رانیوں' بلکہ ایک طرح کی غیر اعلانیہ جنگ (undeclared war) کا خیال کیجیے--- پھر تاریخ کے اوراق میں محفوظ مجاہدین کے طرز عمل پر نظر ڈالیے' تو اقبال کی اس نظم کی

معنویت سمجھ میں آتی ہے۔

اسلام نے جہاد کا جو تصور دیا ہے (اور اقبال کا تصور جہاد بھی، اس سے مختلف نہیں ہے) اس کی حقیقی نوعیت و معنویت، جہاد کے ثمرات و برکات سے متعین ہوتی ہے، اور تاریخ اسلام اس کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ سیدنا حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت کا واقعہ ہے۔ دور فاروقیؓ میں مجاہدین اسلام کی سرگرمیاں پورے عروج پر تھیں۔ اسلامی افواج نے دمشق کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ ایک جانب سپہ سالار ابو عبیدہؓ بن الجراح تھے اور مخالف سمت سے، ان کے کمانڈر خالدؓ بن ولید محاصرین پر دباؤ بڑھا رہے تھے۔ جناب ابو عبیدہؓ نے مصالحت سے کام لیا اور دمشق میں داخل ہو گئے۔ عین اسی وقت حضرت خالدؓ نے محاصرین کو مغلوب کر لیا اور دوسری جانب سے فاتحانہ شہر میں داخل ہوئے۔ دونوں ایک دوسرے کی صورت حال سے بے خبر اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار، قلب شہر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مقام اتصال پر دونوں کو صورت حال کا علم ہوا۔ صورت حال پیچیدہ تھی، مگر اسلام کے قانون بین الاقوام (International Law) پر عمل درآمد کے نتیجے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ فوراً ایک لکیر کھینچ کر شہر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اتفاقی امر یہ کہ شہر کا گرجا دو حصوں میں تقسیم ہو گیا کہ لکیر اس کے درمیان سے گزرتی تھی۔ چنانچہ شہر کے ایک حصے پر، جسے حضرت خالدؓ بن ولید نے فتح کیا تھا، فتح کے احکام کا نفاذ کیا گیا، جب کہ حضرت ابو عبیدہؓ کے ہاتھوں جو علاقہ فتح ہوا تھا، اس پر صلح کے احکام نافذ کیے گئے۔ اس کے نتیجے میں آدھا گرجا مسجد بنا دیا گیا اور باقی آدھا، گرجا رہنے دیا گیا، اور یوں شہر کے آدھے حصے پر، اسلامی قانون کے احکام لاگو کیے گئے اور آدھے حصے پر، جسے حضرت ابو عبیدہؓ نے مصالحت سے حاصل کیا تھا، بدستور عیسائی احکام باقی رکھے گئے۔ اس بنیادی فرق کی وجہ سے جب مسلم احکام والا علاقہ زیادہ عدل و مساوات اور بھائی چارے کا مظہر بنا تو عیسائی رعایا بھی جلد ہی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئی اور اس کے پرزور مطالبے پر شہر کے باقی ماندہ حصے پر بھی مسلم احکام نافذ کر دیے گئے۔ یہ احکام اس وقت تک لاگو نہیں کیے گئے تھے جب تک کہ خود عیسائی آبادی نے اس کا مطالبہ نہیں کیا (ڈاکٹر محمود احمد غازی، خطبات بہاول پور (۲) اسلام کا قانون بین الممالک، اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور، ۱۹۹۷ء، ص ۴۵)۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، جہاد کے مثبت اور وسیع الاطراف اثرات سے تاریخ اسلامی کے اوراق جگمگا رہے ہیں۔ مندرجہ بالا مثال سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ عالم انسانیت کو جیسا امن و انصاف اور جیسی سلامتی جہاد اسلامی کے ذریعے میسر آ سکتی ہے، وہ دور حاضر کے نام نہاد امن معاہدوں اور منافقانہ سمجھوتوں سے ممکن نہیں، چنانچہ تصور جہاد کو دو حوالوں سے روبہ عمل لانے کی ضرورت ہے:

اول: امت مسلمہ کا بڑا حصہ آج بھی جمود و تقلید اور جہالت و جاہلیت کی بھول بھلیوں میں گم ہے، ملوکیت و خانقاہیت کا اسیر اور فریب نفس کا شکار ہے۔ عالم اسلام، مغرب کی سیاسی غلامی سے تو آزاد ہو گیا، مگر

ذہنی و فکری اور تہذیبی و علمی اعتبار سے بدستور اس کا غلام ہے۔ جذبہ جہاد ایسی خود اعتمادی عطا کرتا ہے کہ اس کے ذریعے غلامی و مرعوبیت کا یہ طلسم کافور ہو سکتا ہے۔ فی الوقت مغرب سے رہائی عالم اسلام کی بنیادی ضرورت ہے۔

دوم: عالم اسلام سے آگے بڑھ کر عالم انسانیت پر نظر ڈالیے۔ اقبال کا آخری زمانہ تھا' اٹلی نے حبشہ پر حملہ کر دیا (۱۸ اگست ۱۹۳۵) علامہ کو شدید ذہنی صدمہ پہنچا' ع: ہے کتنی زہرناک ابی سینیا کی لاش۔۔۔ مسولینی کے اس فسطائی اقدام پر اقبال کا ردعمل بہت کرب انگیز تھا:۔

تہذیب کا کمال' شرافت کا ہے زوال
غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گرگ کو ہے برہ معصوم کی تلاش (ضرب کلیم' ص ۱۴۵)

اپنی وفات سے چند ماہ پہلے یکم جنوری ۱۹۳۸ کو سال نو کے ریڈیائی پیغام میں' انھوں نے حبشہ' فلسطین' ہسپانیہ اور چین کے حوالے سے اپنے کرب و اضطراب کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا:

"... The same misery prevails in every corner of man's earthly home, and hundreds of thousands of men are being butchered mercilessly. The Government are sucking the blood of the weaker people economically. It is, as if the day of doom had come upon earth, ... and in which no voice of human sympathy or fellowship is audible.

(Speeches, Writings and Statements of Iqbal' مرتب: لطیف احمد شیروانی' اقبال اکادمی پاکستان' لاہور' ۱۹۷۷' ص ۲۵۰)۔ ترجمہ: یوں محسوس ہوتا ہے کہ انسان کے زمینی گھر کا ہر حصہ ایسی ہی ظلم و بربریت اور خوں ریزی کا شکار ہے' اور سیکڑوں اور ہزاروں انسان بے دردی کے ساتھ ذبح کیے جا رہے ہیں۔ حکومتیں بھی مختلف معاشی حربوں سے غریب عوام کا خون چوس رہی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے زمین پر قیامت برپا ہو گئی ہو' بلکہ حشر کا سماں ہو۔ ایسے میں انسانی ہمدردی اور دوستی کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی۔

عالمی منظر پر نگاہ دوڑایئے' آج بھی صورت حال مختلف نہیں ہے۔ اقبال ایک ابی سینیا پر روئے تھے' آج روے زمین پر کتنے ہی خطے ابی سینیا بنے ہوئے ہیں۔ گرگان مشرق و مغرب' برہ ہاے معصوم کی تلاش میں فلسطین' کشمیر' کوسووا' برما' افغانستان' الجزائر اور سوڈان کو پامال کر رہے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں:۔

کیا اور نہیں غزنوی کارگہ حیات میں بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہل حرم کے سومنات
قافلہ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوے دجلہ و فرات

(بال جبریل' ص ۱۱۲)

ہر نیا دن بڑی طاقتوں کے کاروبار فریب و منافقت اور کمزور ملکوں پر ان کے غلبہ و استیلا کے لیے نئی

سے نئی اسکیمیں سامنے لاتا ہے اور دنیا میں جہاں بھی بڑی طاقتوں کے مظالم' مکر و ریا' اور چال بازیوں کے خلاف آواز اٹھائی جاتی ہے تو مزاحمت کرنے والوں کو کبھی "بنیاد پرست" اور کبھی "دہشت گرد" قرار دیا جاتا ہے' حالانکہ ظلم و استبداد کے خلاف مزاحمت بالکل فطری ہے اور اس کے پس منظر میں کم و بیش وہی روح جہاد کارفرما ہے' جس کا تصور اقبال نے دیا ہے' وہ کہتے ہیں:۔

نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی' نہ حریف پنجہ فگن نئے
وہی فطرت اسد اللہی' وہی مرحبی' وہی عنتری (بانگ درا' ص ۱۵۳)

تازہ ہر عہد میں ہے قصہ فرعون و کلیم (ضرب کلیم' ص ۳۰)

تازہ پھر دانش حاضر نے کیا سحر قدیم (بال جبریل' ص ۶۲)

اقبال محسوس کر رہے تھے کہ "دانش حاضر" کا طلسم ٹوٹنے کو ہے۔ سرمایہ داری کے زوال اور جمہوریت کی ناکامی سے یورپی تہذیب و تمدن حالت نزع میں ہے۔ اس صورت حال میں جذبہ جہاد نظام عالم کی نئی تشکیل میں ایک موثر رول ادا کر سکتا ہے۔[۴۳] اقبال پوچھتے ہیں: ع

اس زمانے میں کوئی حیدر کرار بھی ہے؟ (بال جبریل' ص ۶۴)

اقبال کے اس سوال ہی میں' جواب بھی پنہاں ہے۔ دوسری جگہ انھوں نے یہ وضاحت کر دی: ع

گزر اس عہد میں' ممکن نہیں بے چوب کلیم (بال جبریل' ص ۶۰)

درحقیقت "چوب کلیم" عصر حاضر میں امن عالم کے لیے بہت بڑا سد جارحیت (deterrent) ہے' جیسی اس کی ضرورت آج ہے' شاید پہلے کبھی نہ تھی۔ اقبال کے الفاظ میں: "جہاد' ایک طرح سے اسلام کی روح ہے" (اقبال نامہ' اول' ص ۳۲۳) اور اسی لیے امت مسلمہ کی قوت کا حقیقی سرچشمہ ہے۔ اقبال ہمیں فطرت اسد اللہی کو بروئے کار لانے' اور "چوب کلیم" سے کام لینے کی تلقین کرتے ہیں' کیونکہ **جاھدوا فی اللہ حق جھادہ** کا یہی منشا ہے اور اقبال کے تصور جہاد کی معنویت بھی یہی ہے۔

حوالے اور حواشی

۱۔ "جہاد فی سبیل اللہ" کے موضوع پر یہ اقتباس اس تقریر سے لیا گیا ہے جو علامہ اقبال کی وفات کے ایک برس کے بعد ۱۳ اپریل ۱۹۳۹ کو یوم اقبال منعقدہ ٹاؤن ہال لاہور میں کی گئی (دیکھیے: **اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات**' اسلامک پبلی کیشنز' لاہور' ۱۹۷۳ء' ص ۲۹۴)۔

گیارہ بارہ برس پہلے مولانا مودودی نے اسلامی جہاد پر ایک سلسلہ مضامین **الجمعیتہ** شروع کیا تھا' جو ۱۹۳۰ میں

"مولوی ابوالاعلیٰ صاحب مودودی، رفیق اعزازی دارالمصنفین" کی پہلی علمی تصنیف کی حیثیت سے **الجہاد فی الاسلام** کے نام سے دارالمصنفین اعظم گڑھ سے سرورق کی اس عبارت کے ساتھ شائع ہوئی: "اسلامی جہاد کی حقیقت اور اسلام کے قوانین جنگ و صلح، معترضین کے جوابات اور شکوک و شبہات کا ازالہ، اسلامی قانون کا دوسرے مذاہب اور دوسری قوموں کے قوانین جنگ سے مقابلہ و موازنہ اور موجودہ یورپین قوانین جنگ پر مفصل تبصرہ اور ان پر اسلامی قانون کی برتری"۔ یہ کتاب علامہ اقبال کی نظر سے بھی گزری۔ پھر ۱۹۳۳ سے **ترجمان القرآن** ان کے زیر ادارت نکلنا شروع ہوا، تو یہ بھی علامہ اقبال کے مطالعے میں آتا تھا۔ بعض روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ **الجہاد فی الاسلام** اور مولانا مودودی کی دیگر تحریروں سے وہ متاثر تھے۔ چودھری نیاز علی خاں کو موضع جمال پور نزد پٹھان کوٹ میں اپنے مجوزہ اسلامی مرکز کے لیے کسی موزوں شخص کی تلاش تھی، اقبال کے ایک دیرینہ رفیق سید نذیر نیازی (۱۹۰۰-۱۹۸۱) راوی ہیں کہ ایک ملاقات میں یہی مسئلہ زیر بحث تھا۔ چودھری صاحب قحط الرجال کا شکوہ کر رہے تھے۔ علامہ اقبال کے ذہن میں ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریروں کا ایک تاثر موجود تھا۔ انھوں نے فرمایا: "اس کے باوجود ملک میں ایسے پڑھے لکھے نوجوانوں کی کمی نہیں جن کے دل میں اسلام کا درد ہے اور جو مسائل حاضرہ سے بھی بہ خوبی واقفیت رکھتے ہیں، ان میں نئے اور پرانے تعلیم یافتہ بھی شامل ہیں، ضرورت ان کو جمع کرنے کی ہے"۔

"سردست ایک نام میرے ذہن میں آتا ہے۔ حیدر آباد سے **ترجمان القرآن** کے نام سے ایک بڑا اچھا رسالہ نکل رہا ہے۔ مودودی صاحب اس کے ایڈیٹر ہیں۔ میں نے ان کے مضامین پڑھے ہیں۔ دین کے ساتھ ساتھ وہ مسائل حاضرہ پر بھی نظر رکھتے ہیں، ان کی کتاب **الجہاد فی الاسلام** مجھے بہت پسند آئی، آپ کیوں نہ انھیں دارالاسلام آنے کی دعوت دیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ دعوت قبول کرلیں گے" (**اقبالیات سید نذیر نیازی**، مرتبہ: عبداللہ شاہ ہاشمی، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۹۶، ص ۱۰۴)۔ حقیقت تو یہ ہے کہ غلامی، سرسید اور قادیانیت نے اسلام کے تصور جہاد کو مسخ و منسوخ کرنے کی جو کوشش کی تھی، **الجہاد فی الاسلام** اور علامہ اقبال نے اسے ناکام بناتے ہوئے، تصور جہاد کو اس کا صحیح تناظر عطا کیا۔ یہ ان کا ایسا بڑا کارنامہ ہے جس کے اثرات انقلاب ایران کے علاوہ افغانستان، بوسنیا، کشمیر، فلسطین، شیشان، برما، فلپائن، لبنان اور کوسووا کی مزاحمتی تحریکوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

۲۔ مرزا غلام احمد قادیانی کی اس نظم کا شعر ہے:

اب چھوڑ دو جہاد کا، اے دوستو، خیال
دیں کے لیے حرام ہے اب جنگ اور قتال

مزید برآں انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے: "ہم ان تمام مذہبی جنگوں کے مخالف ہیں، جو جہاد کے طور پر تلوار سے کیے جاتے ہیں" (بہ حوالہ: **ثبوت حاضر ہیں**، مرتبہ: محمد متین خالد، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت، ملتان، ۱۹۹۷، ص ۵۰۷)۔ اقبال نے **جاوید نامہ** میں دو جعلی پیغمبروں کا ذکر کیا ہے، ایک ایرانی (بہاء اللہ) اور دوسرا ہندی (مرزا قادیانی)۔ اقبال کہتے ہیں کہ ایک نے امت مسلمہ کو حج سے، اور دوسرے نے جہاد سے بیگانہ کرنے کی کوشش کی ہے (**جاوید نامہ** ص ۲۰۰)۔

۳۔ اس ضمن میں ۱۵ جنوری ۱۹۳۴ کے خطوط بہ نام سید سلیمان ندوی اور راغب احسن میں علامہ اقبال نے ایک جیسے خیالات کا اظہار کیا ہے (**اقبال نامہ**، اول، ص ۱۸۱، **اقبال جہان دیگر**، مرتبہ: محمد فرید الحق، گردیزی پبلشرز، کراچی، ۱۹۸۳، ص ۶۷)۔

[**وضاحت:** کلام اقبال کے حوالے، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور کے ۱۹۷۳ و مابعد اشاعتوں کے ہیں]۔

تبیان القرآن

ایک مطالعہ

مولانا عبد المالک

شیخ الحدیث مولانا مفتی غلام رسول سعیدی عصر حاضر کے ممتاز مفسر، عظیم القدر محدث اور وسیع النظر فقیہ ہیں۔ متعدد گراں قدر علمی تصانیف ان کی باقیات الصالحات ہیں۔ خصوصاً ۷ جلدوں میں صحیح مسلم شریف کی شرح پیش کر کے ملک کے تمام مکاتب فکر کے علما سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ انھیں علمی گہرائی، گیرائی اور استحضار میں خصوصی مقام حاصل ہے۔ مختصر مدت میں ایک مثالی اور جامع علمی کتاب پیش کر دیتے ہیں۔

زیر نظر تفسیر تبیان القرآن (جلد اول) ۱۰۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ۳۱ صفحات پر مشتمل "حدیث دل" اور مقدمہ ہے جس میں تفسیر کا اسلوب بیان کیا گیا ہے اور مبادی تفسیر کا کافی حد تک احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد سورۃ فاتحہ اور سورۃ البقرہ کی تفسیر ہے۔ یہ سارا کام ڈیڑھ سال کے عرصے میں کیا گیا۔ ۱۰ رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ کو اس تفسیر کا آغاز ہوا اور ۱۲ ربیع الاول ۱۴۱۶ھ کو یہ جلد اختتام کو پہنچی۔ اس تفسیر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں قدیم تفسیری مباحث اور علمی نکات کے ساتھ جدید مباحث کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ عقیدہ، اخلاق، شریعت، طریقت، تصوف اور احکام اور دیگر علمی مباحث کو شرح و بسط سے بیان کیا گیا ہے۔ مباحث کی وسعت اور ہمہ گیری کے لحاظ سے یہ اسم بامسمی ہے۔

مصنف اپنی تفسیر کے متعلق فرماتے ہیں: "میں نے اس تفسیر کو متوسط طریقے پر لکھا ہے۔ اس میں بہت زیادہ تفصیل ہے نہ زیادہ اختصار۔ مسائل حاضرہ پر میں نے شرح و بسط کے ساتھ شرح صحیح مسلم میں لکھ دیا ہے۔ اسی طرح عبادات اور معاملات پر بھی سیر حاصل بحث اس میں آ گئی ہے، تاہم جو مسائل اور مباحث اس میں آنے سے رہ گئے ہیں، ان شاء اللہ انھیں اس میں تفصیل کے ساتھ ذکر کروں گا۔ معاصر اور عہد قریب کے مفسرین کی تحقیقات اور نگارشات کو میں نے پیش نظر رکھا ہے اور جہاں میری

رائے ان سے متفق نہیں ہو سکی' میں نے ادب و احترام کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے" (ص ۳۹)۔

مصنف نے تفسیر میں جن اصولوں کو اپنایا اس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

۱۔ میں نے قرآن مجید کا ترجمہ تحت اللفظ نہیں کیا اور نہ ہی ایسا کیا ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ سے بالکل الگ اور عربی شناسی کی رعایت کیے بغیر قرآن مجید کے مفہوم کی ترجمانی کی جائے۔ ۲۔ تفسیر میں بھی میں نے اسلام کے مسلمہ عقائد کو دلائل سے مزین کیا ہے اور قرآن مجید کی جن آیات میں احکام و مسائل کا ذکر ہے وہاں میں نے تمام فقہی مذاہب کا دلائل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ۳۔ ہمارے متقدمین مفسرین نے قرآن کریم کی تفسیر میں جو نکات بیان کیے ہیں' ان سے میں نے استفادہ کیا ہے لیکن جو بعید نکات ہیں یا دور از کار تاویلات ہیں' ان کو ترک کر دیا ہے۔ ۴۔ میں نے کوشش کی ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر میں زیادہ سے زیادہ احادیث اور آثار کو پیش کروں۔ ۵۔ عام طور پر مفسرین صرف حدیث کا ذکر کر دیتے ہیں' اس کی تخریج نہیں کرتے۔ میں نے کافی محنت اور جانفشانی کر کے تبیان القرآن میں درج ہر حدیث کی تخریج کی ہے اور اس کا مکمل حوالہ بیان کیا ہے۔ البتہ حافظ منذری' حافظ الہیثمی اور حافظ سیوطی چونکہ علم حدیث میں بہت ثقہ ہیں' اس لیے ان کی تصانیف میں درج مسلم ائمہ حدیث کی روایات کو ان کے حوالوں کے ساتھ ذکر کیا ہے اور کہیں کہیں اصل مآخذ کے حوالوں کی بھی نشان دہی کر دی ہے۔ ۶۔ نئے اور تازہ مسائل میں غور و فکر اور اجتہاد کی کافی وسعت اور گنجایش ہے اور ظاہر ہے اس میں علما کی آرا مختلف ہوتی ہیں۔ جو عالم بھی کسی تازہ اور نئے مسئلے میں غور و فکر سے اجتہاد کرتا ہے' وہ پوری دیانت داری اور خدا خوفی سے اس کے حکم کو دلائل شرعیہ سے اخذ کرتا ہے۔ اگر کسی عالم کو اس سے اختلاف ہو تو اس کو دلائل کے ساتھ اپنا نظریہ تو بیان کرنا چاہیے لیکن فریق مخالف پر کیچڑ نہیں اچھالنی چاہیے' اور طعن و تشنیع سے کام نہیں لینا چاہیے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں لوگوں کا یہ مزاج نہیں ہے اور لوگوں کو جس شخص سے کسی علمی مسئلے میں اختلاف ہو وہ اس کو جاہل' خائن اور اس نوع کے دیگر القابات سے نوازتے ہیں بلکہ اس کو دین و ملت سے خارج کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ ان تازہ مسائل میں سے بعض مسائل میں ہمارا دوسرے علما سے اختلاف ہے لیکن ہم نے اپنا موقف دلائل کے ساتھ بیان کیا ہے اور ان علما کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں لکھا' اور ان کے اعزاز و اکرام اور احترام کو پوری طرح قائم رکھا ہے (ص ۳۷-۳۸)۔

مصنف نے ۶۳ کتب۔ تفسیر سے استفادہ کیا۔ بطور خاص جن تفاسیر کو پیش نظر رکھا ان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "ترجمے میں' میں نے زیادہ تر علامہ احمد سعید کاظمی قدس سرہ کے ترجمے البیان سے استفادہ کیا ہے۔ تفسیر میں زیادہ تر احکام القرآن' الجامع الاحکام' القرآن' البحر المحیط' تفسیر کبیر'

الدر المنثور اور روح المعانی سے استفادہ کیا ہے' جب کہ جدید تفاسیر میں سے تفسیر منیر' مراغی' فی ظلال القرآن اور تفسیر قاسمی پیش نظر رہیں۔ احادیث کی بہت سی کتابیں جن کے ہم پہلے صرف نام سنتے تھے الحمدللہ اب وہ چھپ گئی ہیں اور دستیاب ہیں۔ میں نے زیادہ تر کوشش کی ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر میں احادیث کو ان کے اصل حوالہ جات کے ساتھ ذکر کروں۔ اسی طرح فقہی مباحث میں مذاہب ائمہ کو ان کی اصل کتابوں کے حوالے کے ساتھ درج کیا ہے۔ مآخذ اور مراجع کی فہرست سنین وفات کی ترتیب سے مرتب کی ہے اور میرا گمان یہ ہے کہ پہلی بار اس نوع کی فہرست مرتب کی گئی ہے" (ص ۳۸)۔

تفسیر کا مطالعہ کرنے سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ مصنف مدظلہ العالی نے ان خصوصیات اور اصولوں کی پوری طرح پاسداری کی ہے۔ شاید وہ عصر حاضر کے ان چند مفسرین میں شامل ہیں جو ایک مسلک سے وابستہ ہونے کے باوجود مسلکی تعصب کا شکار نہیں اور اپنے مسلک میں متعصب ہونے کے باوجود دوسرے مسالک کا بھی کماحقہ احترام کرتے ہیں۔ پاکستان میں ان سے پہلے مفکر اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور مفتی اعظم پاکستان محمد شفیع صاحبؒ اور چند دیگر مفسرین نے اس کا نمونہ پیش کیا ہے۔

مصنف کی تصانیف کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ مسلکی مسائل میں بریلوی مسلک پر قائم رہتے ہوئے دوسرے مسالک کا احترام کرتے ہیں اور بریلوی مسلک کی توضیح اس طرح کرتے ہیں کہ دوسرے سے دوری کو کم کر دیتے ہیں۔ وہ اس کے لیے دلائل سے بات کرتے ہیں۔ مثلاً مسئلہ استمداد اور ندائے غیراللہ اور توسل کے متعلق مصنف تفصیلی بحث کرتے ہوئے مسلک بریلوی کی توضیح' تشریح اور اثبات کرتے ہیں اور آخر میں اپنا موقف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: "اس اعتقاد کے ساتھ انبیا علیہم السلام اور اولیائے کرام سے استمداد اور استغاثہ کرنا ہرچند کہ جائز ہے لیکن افضل و احسن اور اولیٰ یہی ہے کہ ہر حال اور ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ سے سوال کیا جائے اور اسی سے استمداد اور استقامت کی جائے (الفاتحہ ' آیت ۴' ص ۲۲۹)..... ہمارے فاضل معاصر علامہ محمد عبدالحکیم شرف قادری ثم نقشبندی لکھتے ہیں: البتہ یہ ظاہر ہے کہ جب حقیقی حاجت روا' مشکل کشا اور کارساز اللہ تعالیٰ کی ذات ہے تو احسن اور اولیٰ یہی ہے کہ اسی سے مانگا جائے اور اسی سے درخواست کی جائے اور انبیا و اولیا کا وسیلہ اس کی بارگاہ میں پیش کر دیا جائے کیونکہ حقیقت' حقیقت ہے اور مجاز' مجاز ہے" (ص ۲۱۷)۔

علم غیب کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "خلاصہ بحث یا اس تمام بحث کا ماحاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو علیٰ حسب المراتب غیب کی خبروں پر مطلع فرمایا ہے لیکن غیب مطلق (یعنی تمام معلومات کا احاطہ کاملہ) یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور اسی کو غیب مطلق کا علم ہے۔ غیب کی جن خبروں پر اللہ تعالیٰ نے اپنے خواص کو مطلع فرمایا ہے ان کے اعتبار سے ان بندوں کو غیب کا علم ہے لیکن

اس کو علم الغیب کہنا درست نہیں۔ کیونکہ ان کو ایسی صفت حاصل نہیں ہے جس سے ان پر ہر غیب منکشف ہو۔ یہ علامہ شامی کی بیان کردہ توجیہ ہے۔ علامہ آلوسی کی توجیہ یہ ہے کہ اگرچہ ان کو بعض غیوبات پر مطلع کیا گیا ہے لیکن ظاہر آیات سے تعارض کی بنا پر یہ کہنا درست نہیں کہ ان کو غیب کا علم ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان کو غیب پر مطلع کیا گیا ہے یا ان پر غیب ظاہر کیا گیا ہے۔ امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ کی تحقیق ہے کہ مطلقاً علم غیب بولا جائے تو اس سے ذاتی علم مراد ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا جائز نہیں کہ فلاں شخص کو علم غیب ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بعض غیوب کو ظاہر فرمایا۔ آپ کو بعض غیوب پر مطلع کیا گیا یا آپ کو غیب کی خبریں دی گئیں۔ جن علما اور فقہا کی عبارات میں مخلوق کی طرف علم غیب کا اسناد کیا گیا ہے، وہاں چونکہ غیب سے مراد غیب مطلق نہیں ہے، اس لیے وہ عبارات عقلاً جائز ہیں اور کفرو شرک نہیں ہیں۔ لیکن ایسا کہنا شرعاً مستحسن نہیں" (ص ۲۷۵)۔

مَا اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ کی تحقیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "امیر یا کسی معظم شخص کی آمد پر جانور کو ذبح کیا گیا ہو تو یہ ذبیحہ حرام ہے کیونکہ یہ ما اھل بہ لغیر اللّٰہ ہے، خواہ اس کو اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو (درمختار، ص ۶۷۶-۶۷۷)۔ اگر کوئی شخص غیراللہ کی نذر مانے، مثلاً یہ کہے کہ اگر فلاں بزرگ نے میرا کام کر دیا تو میں اس بزرگ کے لیے ایک بکرا ذبح کروں گا، سو یہ نذر حرام ہے۔ کیونکہ البحرالرائق اور فقہ کی دیگر کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ نذر عبادت ہے اور مخلوق کی نذر ماننا حرام ہے۔ اور اگر اس شخص نے اس بزرگ کی تعظیم کے لیے اس بکرے کو ذبح کیا تو فقہا کی تصریحات مذکورہ کی بنا پر وہ ذبیحہ حرام ہوگا اور مَا اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ کا مصداق ہوگا" (ص ۶۷۷)۔ یہ اور اسی نوع کی تحقیقات اپنے مسلک کی توضیح کے ساتھ دوسرے مسالک کے ساتھ علمی تقارب کی کوشش قابل قدر اور خراج تحسین کی مستحق ہے۔

مصنف نے مختلف موضوعات پر گراں قدر علمی تحقیقات پیش کی ہیں۔ مثلاً سنت و بدعت کے بارے میں درج ذیل علمی بحث نہایت عمدہ ہے۔

"ڈاڑھی میں قبضہ کی بحث" کے عنوان سے لکھتے ہیں: "بعض علما ڈاڑھی میں قبضہ کو واجب کہتے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ وجوب رسول صلی اللہ کے امر سے ثابت ہوتا ہے اور کسی حدیث میں یہ نہیں ہے کہ آپ نے قبضہ تک ڈاڑھی رکھنے کا امر فرمایا ہو۔ بعض علما وجوب پر یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دائماً قبضہ تک ڈاڑھی رکھی اور کبھی اس کو ترک نہیں کیا اور یہ وجوب کی دلیل ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ صرف دوام سے وجوب ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ نے اس فعل کے ترک پر انکار بھی فرمایا ہو۔ جیسا کہ علامہ ابن نجیم نے فرمایا ہے اور علامہ ابن ہمام کی بھی یہی تحقیق ہے۔ اور کسی حدیث میں یہ منقول نہیں ہے کہ آپ نے قبضہ سے کم ڈاڑھی رکھنے پر انکار فرمایا ہو۔

نیز آپ وضو میں ہمیشہ دائیں جانب سے ابتدا کرتے تھے اور یہ بالاتفاق واجب نہیں ہے بلکہ مستحب ہے۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ نفس ڈاڑھی رکھنا واجب ہے اور منڈانا حرام ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ڈاڑھی منڈانے والے مجوسی پر انکار فرمایا (المصنف، ج ۸، ص ۳۷۹)۔ نیز ڈاڑھی رکھنا اسلام اور مسلمانوں کا شعار ہے۔ البتہ قبضہ تک ڈاڑھی رکھنا واجب نہیں ہے۔ لیکن ڈاڑھی کی اتنی مقدار رکھنا ضروری ہے جس پر عرف میں ڈاڑھی کا اطلاق آسکے کیونکہ احکام میں عرف کا اعتبار ہے۔ علامہ شامی نے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ ؒ کا قاعدہ یہ ہے کہ جس چیز کی شرعاً مقدار معین نہ ہو اس میں مبتلا بہ کی رائے کا اعتبار ہوتا ہے" (رد المحتار، ج ۱، ص ۱۲۸، مطبوعہ بیروت، ۱۴۰۹ھ، ص ۵۳۷)۔

اپنی طرف سے عبادت کے طریقے مقرر کرنے کی مذمت کے عنوان پر فرماتے ہیں: "اس سے معلوم ہوا کہ اپنی عقل سے عبادت کے طور طریقے وضع کرنا جائز نہیں۔ لوگ اپنی عقل سے عبادت کے طریقے وضع کر لیتے ہیں، پھر اس کی تائید میں دلائل شرعیہ تلاش کرتے ہیں اور جو ان کے بنائے ہوئے طریقے کے مطابق عبادت نہ کریں، ان کو لعنت ملامت کرتے ہیں۔ اسی کا نام احداث فی الدین اور بدعت سیئہ ہے۔ عبادت صرف اسی طریقے سے کرنی چاہیے جس طریقے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کی۔ اور جس طرح آپ صلعم نے ہدایت دی ہے اور جماعت صحابہ کا اس پر عمل رہا ہے" (ص ۱۵۷)۔

اس کے علاوہ آیات سے علمی عجائب و غرائب، احکام خصوصاً ایسے مسائل جن کی روز مرہ کی عملی زندگی میں حاجت پیش آتی ہے، مصنف نے شرح و بسط اور دلائل سے ان پر بحث کی ہے۔ مثلاً بسم اللہ میں رسول اللہ کی طرف رمز اور اشارہ (ص ۱۵۵)، دین، شریعت اور مذہب وغیرہ کی تعریفات (ص ۱۸۳)، ایمان لانے کے لیے صحابہ کرام ؓ کے ایمان کا معیار ہونا (ص ۳۰۷)، صحابہ کرام ؓ کے سب و شتم کی مذمت اور رد (ص ۳۱۰)، عصمت انبیا کے اصطلاحی معنی (ص ۳۶۵)، خواتین کی امامت کی تحقیق (ص ۳۹۳)، سمجھ دار نابالغ لڑکے کی امامت کی تحقیق (ص ۳۹۷)، طاعون کے متعلق قدیم علما اور جدید میڈیکل سائنس کی تحقیق (ص ۴۲۹)، سحر کے لغوی معنی، سحر کے شرعی معنی (ص ۴۸۴ تا ۴۹۴)، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے والے کے شرعی حکم کی تحقیق، گستاخانہ کلام میں توہین کی ہیئت کی بحث (ص ۴۹۸ تا ۵۰۱)، مسئلہ امامت کی بحث (ص ۵۴۸ تا ص ۵۶۳)۔ مسئلہ تحویل قبلہ (ص ۵۹۲ تا ۵۹۶)، کعبہ کا اولیا اللہ کی زیارت کرنا (ص ۵۹۷) کے موضوع پر تحقیق کے بعد فرماتے ہیں: "اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں کعبہ کی تعظیم و توقیر و ہیبت اور جلال اور زیادہ کرے۔ ہمیں یہ نقول اور دلائل یعنی (کعبہ کا اولیا اللہ کا طواف کرنا) خصوصاً اس لیے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سید الانبیا ہیں لیکن آپ صلعم نے کعبہ کا طواف کیا اور آپ کے گرد کعبہ کا طواف کرنا ثابت نہیں" (ص ۵۹۸)۔ عدالت صحابہ اور حجت اجماع (ص ۵۹۵)، ہر نبی کے

پیدائشی ہونے یا نہ ہونے کی تحقیق (ص ۶۱۸)، نبیوں، رسولوں، کتابوں اور صحیفوں کی تعداد (ص ۶۱۹)، مردہ کافروں پر لعنت کرنے کا جواز اور زندہ کافروں پر لعنت کرنے کی ممانعت (ص ۶۴۹)، ملکی اور غیر ملکی صابنوں کو استعمال کرنے کا شرعی حکم (ص ۶۶۵)، ضرورت کی وجہ سے ایک شخص کے جسم میں دوسرے شخص کے خون کو منتقل کرنے کا جواز (ص ۶۶۷)، ضرورت کے وقت حرام چیزوں سے علاج کے متعلق احادیث اور فقہاے اسلام کی تشریحات (ص ۶۷۰)، انجکشن لگوانے سے روزہ ٹوٹنے کا بیان (ص ۷۰۷)، قطبین میں نماز اور روزہ کی تحقیق (ص ۷۱۶)، مال حرام سے صدقہ کرنے کا شرعی حکم (ص ۷۴۰)، قاضی اور دیگر سرکاری افسروں کے ہدیہ قبول کرنے کی تحقیق (ص ۷۴۳)، قضا کے ظاہراً باطناً نافذ ہونے میں مذاہب ائمہ۔ حرمت والے مہینوں میں ممانعت قتال کے منسوخ ہونے کی تحقیق (ص ۸۰۳)، مرتد کی تعریف اور اس کا شرعی حکم (ص ۸۰۵)، لاٹری اور انعامی بانڈز کا شرعی حکم (ص ۸۱۶)، بہ یک وقت تین طلاقوں کے حکم میں جمہور کا موقف، امام ابن تیمیہ کا موقف، علما شیعہ کا موقف (ص ۸۵۶ تا ۸۷۹)، چلتی ٹرین اور طیارے وغیرہ میں نماز پڑھنے کا بیان (ص ۹۰۵)، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت اور آپ صلعم کی افضلیت اور کمالات (ص ۹۳۶ تا ۹۶۸)، صدقہ اور عشر اور خراج کے موضوع پر بحث (ص ۱۰۰۰ تا ۱۰۲۱)، سود کے متعلق بحث (ص ۱۰۲۳ تا ص ۱۰۴۵)، قرض اور دین کے موضوع پر بحث (ص ۱۰۴۶ تا ۱۰۵۴)، شہادت اور اس کے موضوع پر بحث (ص ۱۰۵۴ تا ۱۰۷۰)، خاتمہ سورۃ پر بحث (ص ۱۰۷۱ تا ۱۰۸۱)۔ مذکورہ عنوانات اور دیگر بے شمار علمی عنوانات پر نہایت عالمانہ انداز میں تحقیق کی گئی ہے۔ آیات سے جو احکام مستنبط ہوتے ہیں، ان پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے جو علما، طلبا اور عامۃ المسلمین کے لیے قیمتی معلومات اور فوائد پر مشتمل ہے۔

مصنف کے نقطۂ نظر سے بعض جگہ ہمیں اختلاف ہے اور ان سے علمی اختلاف کا حق ہماری طرح ہر صاحب علم کو ہے۔ لیکن مصنف نے جو انداز بیان اختیار کیا ہے، علمی تحقیق میں جس جرأت اور دیانت داری اور اعتدال کا مظاہرہ کیا ہے، اس پر وہ خراج تحسین کے مستحق ہیں۔ نیز ان کی وہ علمی تحقیقات جو خالص علمی حیثیت رکھتی ہیں وہ گراں قدر ہیں اور تمام اہل علم کی ضرورت ہیں۔ اس لیے یہ تفسیر اس بات کی حق دار ہے کہ ہر صاحب علم کی الماری کی زینت ہو۔ مصنف نے جس تیزی سے تفسیر لکھنے کا کام شروع کیا ہوا ہے، اس سے یہ امید پیدا ہوتی ہے کہ وہ جلد ہی اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیں گے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اس کی توفیق عطا فرمائے اور ان کی اس تفسیر کو مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر میں اتحاد و اتفاق کا ذریعہ اور ایک دوسرے سے استفادے کی بنیاد بنا دے۔ دوسرے علما کو بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق سے نوازے۔ آمین (ناشر: فرید بک سٹال، ۳۸- اردو بازار، لاہور، ہدیہ: درج نہیں)

رسائل و مسائل

تحدید نسل اور تربیت اولاد

سوال: ترجمان القرآن (فروری ۹۸) میں ڈاکٹر تسنیم ابراہیم کے ایک مقالے کا ترجمہ "مسلم ممالک میں خاندانی منصوبہ بندی: ہمدردی یا سازش" شائع کیا گیا تھا۔ اس پر جامعہ کی ایک طالبہ نے اپنے تفصیلی مکتوب میں بعض نکات اٹھائے۔ ان کا موقف تھا کہ تحدید نسل کی کوششوں کو سازش قرار دینے کے بجائے معاشرتی حقائق کے پس منظر میں غور کیا جائے تو اس کی حقیقی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ آبادی میں اضافے کے بجائے موجودہ آبادی کی صلاحیتوں میں اضافے پر توجہ دینا چاہیے۔ بچوں کی تعداد زیادہ ہو تو معیار زندگی' صحت اور تعلیم و تربیت کے حوالے سے ان کی مناسب دیکھ بھال نہیں ہو سکتی۔ یہ کہنا کہ مغرب مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی سے خائف ہے کہ وہ دنیا پر کثرت تعداد کی بنا پر غلبہ حاصل کر لیں گے' محل نظر ہے۔ قلت وسائل' غربت اور پسماندگی کی شکار قومیں افرادی قوت کے باوجود وافر وسائل اور معاشی ترقی کے بغیر کیسے غلبہ حاصل کر سکتی ہیں؟ آج غریب آبادیوں میں کثرت اولاد کی وجہ سے جو صورت حال ہے' اگر مولانا مودودی مرحوم بھی خود مشاہدہ کرتے تو اپنی رائے پر نظرثانی کر لیتے۔ اسلام دین فطرت ہے۔ قیاس' استحسان یا استصلاح کے اصولوں کے تحت اس مسئلے کا ایک ایسا حل ہونا چاہیے جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔

جواب: مجھے آپ کا خط پڑھ کر قلبی مسرت ہوئی کہ الحمدللہ ہماری جامعات میں تعلیمی زوال کے اس دور میں بھی بعض ایسی طالبات اور طلبہ موجود ہیں جو فکری تعصب کی جگہ دلائل و براہین کو معیار حق قرار دیتے ہیں۔ ہمارے فرسودہ لادینی نظام تعلیم میں تحقیق و تحلیل کو جس طرح نظرانداز کیا گیا ہے وہ دینی مدارس کی مقلدانہ فکر سے کوئی بہت مختلف نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ سوچنے سمجھنے والے اذہان میں اضافہ فرمائے۔

تحدید نسل' آبادی کی منصوبہ بندی (planned parenthood) کا مقصد یہ بتایا جاتا ہے کہ اس طرح غیر محدود طور پر بڑھتی ہوئی آبادی کو قابو میں لا کر اس کی صحت' تعلیم و تربیت اور زندگی کے معیار کو بلند کیا

تدریج قلت خطرناک معاشرتی عدم توازن پیدا کر دے گی' ایک عمدہ شاکلہ تو ہے مگر حقائق کو ظاہر نہیں کرتا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اعلیٰ طبقے کے نابغہ باصلاحیت اور قائدانہ صفات کے افراد کو وسائل حاصل ہونے کے باوجود کس نے حد سے حد "دو اچھے بچوں" پر قناعت کا حکم دیا ہے۔ وہ کیوں نہیں اپنے وسائل کے لحاظ سے اوسطاً ۸ بچے پیدا کرتے؟ اگر بات محض مفروضے کی ہے تو یہ کیوں فرض کیا جائے کہ نچلے طبقے کی کثرت ملک پر قابض ہو جائے گی۔ یہ کیوں فرض نہ کیا جائے کہ باحیثیت اور زیادہ باصلاحیت افراد جن کے پاس مادی وسائل بھی ہیں' ان کی کثرت ہو تاکہ ایک صحت مند توازن وجود میں آسکے۔

آخر میں انتہائی اختصار کے ساتھ صرف دو تین نکات خود تحدید نسل کے بارے میں۔

میں سمجھتا ہوں کہ جس بچے کو اللہ تعالیٰ نے پیدا ہونے کا بنیادی انسانی حق دیا ہے اور جن ماں باپ کو عقد نکاح کے ذریعے اپنے گھر میں ایک دوسرے کا لباس قرار دیتے ہوئے قرآنی استعارے میں کھیتی میں کاشت کا بنیادی حق دیا گیا ہے' انھیں کوئی حکومتی ادارہ کسی طرح قانون کے زور سے اس انسانی حق سے محروم نہیں کر سکتا۔ تحدید نسل' دراصل بنیادی انسانی حقوق پر ایک ڈاکا ہے اور ریاست کا اپنے فرائض کی ادائیگی سے فرار کا اعلان ہے۔

ثقافتی اور تہذیبی ورثے کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اگر ایک گھر میں حد سے حد "دو بچے ہی اچھے" ہو سکتے ہیں تو اس کے معاشرتی نتائج یہ ہوں گے کہ اگر یہ دو بچے لڑکے ہیں تو ان لڑکوں کی اولاد خالہ اور پھوپھی کی اصطلاحات کو استعمال نہیں کر سکے گی کیونکہ ان کی اولاد صرف چچا یا تایا کی اصطلاحات کو ہی جانے گی۔ اگر یہ دونوں بچیاں ہیں تو ان کی اولاد ماموں اور چچا اور تایا تینوں اصطلاحات سے ناواقف ہوگی۔ اس طرح عملاً تہذیبی اور ثقافتی ورثہ اور رشتوں کا وجود جسے قرآن کریم صلہ رحمی کہتا ہے' عملاً قطع رحمی میں تبدیل ہو جائے گا۔ کیا ایسا مستقبل تابناک' ترقی یافتہ اور مشفق کہا جا سکتا ہے؟

تحدید نسل کے موید بڑے طمطراق سے بار بار عزل کی سکوتی اجازت کو اس طرح بیان کرتے ہیں جیسے یہ کوئی نئی دریافت اور برہان قاطع ہو۔ بلاشبہ جو انفرادی آزادی ایک حدیث ہمیں فراہم کرتی ہے' اسے قیامت تک کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ لیکن ہماری نگاہ میں عزل کی حلت و حرمت کا تعلق شخصی اور ذاتی آزادی کے مسئلے سے ہے' جب کہ تحدید نسل کی حیثیت ایک ریاستی پالیسی (state policy) کی ہے۔ عقلی اور نقلی حیثیت سے عزل نہ کرنے کے اختیار کو ریاست (state) نہ سلب کر سکتی ہے اور نہ قرآن و سنت کی ریاستی پالیسی (state policy) کو جو کثرت آبادی کی ہے' منسوخ کر سکتی ہے۔ ایسا کرنا مقاصد شریعہ سے متصادم اور عملاً ریاستی تشدد (state terrorism) اور بنیادی انسانی حق سے محروم کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے

پیدائش میں وقفے کے فطری طریقے پر عمل کرتا ہے تو آیندہ ۲ سال تک اس کے ہاں عموماً کوئی اولاد نہیں ہوتی۔ اس کے مقابلے میں ایک اور شخص جس کی شادی ۱۹۹۵ ہی میں ہوئی تھی' ۱۹۹۹ میں ۳ بچوں کا باپ بن جاتا ہے۔ پہلے شخص کی بچی ۱۹۹۹ کے آخر میں اسکول جانے کے قابل ہو جاتی ہے' جب کہ دوسرے شخص کا پہلا بچہ ۱۹۹۹ میں اسکول جانے کے قابل ہوتا ہے۔ اگر دونوں افراد اپنے بچوں کو ایک پرائیویٹ اسکول میں داخل کرانا چاہتے ہیں تو انھیں کم از کم ۱۰ تا ۱۵ ہزار روپے فی بچہ ضرورت پڑتی ہے۔ اس رقم میں درسی کتب' سواری کا خرچہ' یونیفارم' فیس' غرض وہ سب اخراجات شامل ہیں جو ایک بچے کو اعلیٰ معیار پر تعلیم دلانے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔

گو یہ مثال قیاسی نظر آتی ہے لیکن عملاً یہی شکل آج ہمارے تمام بڑے شہروں میں پائی جاتی ہے۔ اس لیے اتنی قیاسی بھی نہیں۔ اب اگر جس پاکستانی فرد کی ہم بات کر رہے ہیں وہ فی الواقع نچلے معاشی طبقے سے تعلق رکھتا ہے تو کیا ۵ ہزار روپے ماہانہ تنخواہ پر وہ صرف ایک بچے کی صحیح تعلیم و تربیت بھی کر سکے گا؟ گویا تعلیم و تربیت کا تعلق محض آبادی میں کمی یا اس کی تحدید سے نہیں ہے۔ اس کا تعلق اور بہت سے بنیادی سوالات سے بھی ہے۔ مثلاً تعلیم کا معاشی پہلو' نجی اور سرکاری شعبے میں معیار کا فرق اور ہمارا تصور تعلیم۔ یعنی کیا ہم صرف بیرونی نصاب پڑھے ہوئے بچوں کو تعلیم یافتہ سمجھتے ہیں یا سرکاری یا نیم سرکاری مدارس میں تعلیم پانے والے بچوں کو بھی تعلیم یافتہ تصور کرتے ہیں۔ گویا ہمارا تعلیم اور رہن سہن کے معیار کا تصور کیا ہے۔ اسی طرح اگر تعلیم کو ایک تجارت بنا دیا گیا ہو' تو وہ لوگ بھی جو صرف ایک ہی "اچھے" بچے کی پیدائش پر خود کو نوبل پرائز کا مستحق سمجھتے ہوں وہ بھی اس کی تعلیم و تربیت تنہا اپنے وسائل سے نہیں کرا سکتے۔

اب چند لمحات کے لیے یہ مان لیجیے کہ بچے کی تعلیم و تربیت کسی نجی یا سرکاری مدرسے میں نہیں ہونی بلکہ خود ماں باپ ہی کو کرنی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر صرف ایک یا ۲ بچے ہوں گے تو کیا ماں باپ زیادہ توجہ دے سکیں گے یا اگر ۶ یا ۸ بچے ہوں گے تو توجہ تقسیم ہو جائے گی؟ اس سوال کا جواب محض قیاس سے دینے کے بجائے اگر صرف چند درمیانے یا نچلے طبقے کے خاندانوں کا مطالعہ کر لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ بچے کی تربیت ایک ایسا معاملہ ہے جس کا تعلق اولاد کی تعداد سے نہیں بلکہ والدین کی اپنی افتاد طبع کے ساتھ ہے۔ اگر والدین خود غرض اور محض اپنی دنیا میں مگن رہنے والے ہوں تو چاہے ان کی اولاد صرف ایک ہو یا ۸' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ہمارے معاشرے میں ایسے بہت سے افراد موجود ہیں جنھوں نے انتہائی محدود وسائل کے باوجود اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت' زیادہ وسائل والے افراد سے زیادہ بہتر طور پر کی ہے۔ میری اپنی یونی ورسٹی میں کام

کرنے والے ایک ڈرائیور نے جس کے ۸ بچے ہیں نہ صرف اپنے ایک لڑکے کو ایم اے انگلش کرانے کے بعد مقابلے کے امتحان میں بٹھایا بلکہ بقیہ لڑکوں اور لڑکیوں کو بھی انٹرمیڈیٹ اور بی اے تک تعلیم دلوائی اور ساتھ ہی ان کی تربیت بھی توجہ کے ساتھ کی۔ میرے علم میں ایسے افراد بھی ہیں کہ کثیر مالی وسائل ہونے کے باوجود ایک یا ۲ بچوں کو نہ صحیح تعلیم دلوا سکے اور نہ صحیح تربیت کر سکے۔ گویا معاشی وسائل اور بچوں کی تعداد کو کم رکھنے کا تعلق منطقی طور پر بچے کی تعلیم و تربیت سے زیادہ خود والدین کے اولاد کے ساتھ رویے' تصور حیات اور کامیاب زندگی کے تصور کے ساتھ ہے۔

عملی طور پر جائزہ لیا جائے تو آٹھوں بچے نہ ایک وقت میں (عام حالات میں) ہوتے ہیں اور نہ یہ ضروری ہے کہ لازماً ہر سال باقاعدگی سے ایک بچہ ہو۔ عموماً جب پہلے بچے کی عمر فطری عمل کے نتیجے میں ۲ سال کے لگ بھگ ہو رہی ہو گی تو اس وقت دوسرے بچے کی شروعات ہوں گی۔ اس طرح ۳' ساڑھے تین سال کی عمر سے پہلے بچے کی رسمی تعلیم و تربیت شروع نہ ہو گی۔ اگر والدین اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے اس پہلے بچے کی صحیح تعلیم و تربیت ۳ سال کی عمر سے کریں تو بعد کے آنے والے بچوں کے لیے بھی یہ بچہ خود ایک مثال (role model) بن جاتا ہے اور خود پہلا بچہ نئے آنے والے کے لیے قابل تقلید تعلیمی مثال پیش کرتا ہے۔ اس طرح تربیت کا عمل والدین اور پہلی اولاد میں بٹ جاتا ہے۔ یہ وہ بنیادی مادی حقائق (ground realities) ہیں جن کے لیے کسی کا علوم عمران میں ایم اے یا پی ایچ ڈی ہونا قطعاً شرط نہیں ہے۔ صرف عائلی اور معاشرتی حقائق سے عملی واقفیت کافی ہے۔

اب اختصار سے دیکھیے کہ کیا اسلام انسانی آبادی کے حوالے سے مقداری (quantitative) تصور اختیار کرتا ہے یا معیاری (qualitative) نظریے کو پسند کرتا ہے۔ قرآن کریم نے سورہ نساء میں' انسان کی تخلیق اور رشتہ ازدواج کے حوالے سے "کثرت رجال" کی شکل میں جو اشارہ کیا ہے' اسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے' جن میں امت میں کثرت کا ذکر پایا جاتا ہے' تقویت حاصل ہوتی ہے۔ یہی رجحان ال عمرٰن ۳:۳۸' الفرقان ۲۵:۷۴ اور النحل ۱۶:۷۲ میں نظر آتا ہے۔ ہمیں علم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادہ اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت رکھنے والی خاتون کو افضل قرار دیا (ابوداؤد' نسائی)۔ حضرت انسؓ کو دعا دیتے ہوئے دولت اور بچے' دونوں کی کثرت کی دعا فرمائی۔ اسی کثرت افراد کو سورۃ الاعراف میں اللہ تعالیٰ کے احسان سے تعبیر کیا گیا ہے (۷:۸۶)۔

ان واضح ہدایات کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی بہ اصرار کہی جا سکتی ہے کہ قرآن میں معیار (quality) پر بھی زیادہ زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ (الصّٰفّٰت ۳۷:۱۰۰) سے واضح ہوتا ہے کہ محض فرزند نہیں بلکہ صالح اولاد کی طلب کی تلقین گئی ہے۔ یہی بات سیدہ مریم کے حوالے سے دعا میں نظر

آتی ہے۔ (آل عمرٰن ۳:۳۶)۔ لیکن تقویٰ' صالحیت اور "بر" کو اہمیت دینے کا یہ مطلب کیسے لیا جا سکتا ہے کہ "صالحیت" اگر ایک بچہ ہو تو ہو گی' ۱۱ بچے ہونے کی شکل میں صرف ۱/۱۱ ہو گی؟ یا یہ کہ اللہ تعالیٰ ایک یا ۲ بچوں کی حد تک تو اپنے بے اندازہ وسائل میں سے کچھ مال' کچھ علم اور کچھ صالحیت دے دیں گے لیکن اگر بچے زیادہ ہوئے تو اللہ کے خزانے میں کمی آ جائے گی۔ یہ مسئلہ کلامی یا ریاضیاتی نہیں' عملی نوعیت کا ہے۔

آخر میں ایک دو مزید مختصر نکات پر غور کر لیا جائے۔ میرے خیال میں یہ کہنا کہ تربیت یا کثرت و قلت اولاد کے حوالے سے زیادہ "تجربی علم" خواتین کا ہی ہو سکتا ہے' ایک مبنی بر جنس تصور ہے۔ قرآن اور صاحب صص قرآن کی تعلیمات اس مبنی بر جنس تصور سے ارفع ہیں۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ امریکی معاشرے اور پاکستانی معاشرے میں معاشی' معاشرتی' تعلیمی' نفسیاتی اور رسوم و رواج غرض ہر لحاظ سے اختلاف پایا جاتا ہے لیکن انسانی فطرت دنیا میں ہر جگہ ایک ہے۔ قرآن و سنت جو فطرت کے مطابق تعلیمات پیش کرتے ہیں' ہر جگہ ان پر یکساں عمل کیا جائے گا۔

یہ سمجھنا بھی قطعاً درست نہیں کہ مولانا مودودی مرحوم کے زمانے میں شاید وہ مسائل نہ ہوں جو آج وجود میں آئے ہیں۔ مولانا کا انتقال ۱۹۷۹ میں ہوا ہے اور اسلام اور ضبط ولادت کی طبع جدید نظرثانی شکل میں ۱۹۶۱ میں ہوئی جو پچھلی صدی کی بات نہیں۔ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ جناب مالتھس (Malthus) اور ان کی ذریت کو ان مسائل کا علم نہ تھا جن سے مولانا مودودیؒ واقف تھے تو شاید زیادہ درست ہو۔

یہ خیال کہ بچوں کی کثرت کے ساتھ ان پر توجہ معاشیات کے قانون Law of deminishing return کی پیروی کرتے ہوئے کم ہوتی جاتی ہے' ایک عمدہ قیاس تو ہو سکتا ہے لیکن عمل کی دنیا اس سے بہت مختلف شکل پیش کرتی ہے۔

تبدیلی قیادت کے حوالے سے بھی کئی تصورات پائے جاتے ہیں۔ مولانا مودودی مرحوم سرمایہ دارانہ اور اشتراکی تصورات کا عقلی رد کرتے ہوئے نہ مڈل کلاس کی قیادت کو مانتے ہیں اور نہ مزدور کی بادشاہت کو۔ ان کا تصور قرآن و سنت پر مبنی اہلیت' امانت اور تقویٰ رکھنے والی قیادت کا تصور ہے جس میں معاشی اور طبقاتی کلاس کی کوئی گنجائش نہیں۔ ٹائن بی یا دیگر مغربی مورخین و مفکرین نے متوسط طبقے کی فکری قیادت (leadership of the elite) کے تصور کو یورپ کے پس منظر میں بطور ایک عمرانی قانون کے پیش کیا ہے' جب کہ یہ قطعاً ضروری نہیں کہ اگر یہ تصور انقلاب فرانس میں کام کر گیا ہو تو یہ روس میں بھی کامیاب ہو۔ تاریخ بتاتی ہے کہ روس کا انقلاب دانش ورانہ قیادت کے تصور کی نفی کرتا ہے۔

اس لیے یہ خیال کہ نچلے طبقے کے افراد کی کثرت اور اعلیٰ اور متوسط طبقے کے "ذہین و نابغہ" افراد کی بے

جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایک عام فہم مثال سے ہم اسے یوں ظاہر کرسکتے ہیں کہ اگر ایک خاندان جس کی آمدنی ۵ ہزار روپے ماہانہ ہے اور صرف ایک یا ۲ "اچھے" بچوں پر مشتمل ہے تو ان کی تربیت و تعلیم اعلیٰ معیار پر ہو گی۔ اس کے مقابلے میں ایک شخص کی آمدنی ۵ ہزار روپے ماہانہ ہے لیکن ۲ "اچھے" بچوں کی جگہ ۶ "غیر اچھے" بچے ہیں تو ان کی تعلیم و تربیت غیر معیاری ہی ہو گی۔

گفتگو کے آغاز کے لیے ہم سمجھتے ہیں کہ تعلیم و تربیت اور صحت کے علاوہ چند اور پہلوؤں سے بھی تحدید آبادی کے مسئلے پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ خصوصاً اقوام متحدہ کے ذیلی اداروں اور مغربی ممالک کی طرف سے کام کرنے والی سیکڑوں غیر حکومتی تنظیموں (N.G.O's) کے تحدید آبادی کے منصوبوں کو اپنی توجہ و ترجیح کا مرکز بنانے کے حوالے سے یہ غور کرنے کی ضرورت کہ گذشتہ ۱۰ سال کے عرصے میں ان تمام اداروں کو مسلمانوں کی بھلائی، ترقی، تعلیم اور صحت بہتر کرنے کی ضرورت اچانک کیوں لاحق ہو گئی؟ پھر امت مسلمہ کو ترقی یافتہ ممالک کے مقام پر، تحدید آبادی کے ذریعے، پہنچا دینے کا درد کیوں بار بار دل میں اٹھنے لگا؟ میں پورے اطمینان قلب کے ساتھ "سازشی طریقے" کا مخالف ہوں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی سمجھتا ہوں کہ جس طرح اقوام متحدہ کے ذیلی اداروں اور سیکڑوں غیر حکومتی تنظیموں (N.G.O's) کو "خالص انسانی ہمدردی" کا دورہ پڑ سکتا ہے، اسی طرح ترقی پذیر ممالک کے باشندوں کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ معروضی طور پر ان منصوبوں کا جائزہ لیں۔ اور اگر یہ منصوبے ان کے مفاد کے منافی ہوں تو اجتہاد، استحسان اور مصلحہ عام جیسے اہم فقہی اصولوں کی بنیاد پر ان منصوبوں کے حسن و قبح کو ظاہر کریں۔

مجھے اس بات سے بھی پورا اتفاق ہے کہ اگر فقہاے امت نے اور بالخصوص دور جدید میں، مفکر اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے، تحدید نسل پر اپنی معرکہ آرا کتاب اسلام اور ضبط ولادت میں اس مغربی تحریک کی مخالفت کی ہے تو یہ مخالفت ہمیں نفس موضوع پر نئے سرے سے تحقیق و گفتگو کرنے سے نہیں روکتی۔ جہاں تک میں سید مودودیؒ کی فکر کو سمجھتا ہوں وہ اپنی کسی بھی رائے کو قطعی اور حتمی نہیں سمجھتے تھے۔ اس لیے نفس مسئلہ پر بھی موصوف کی خواہش کے مطابق اسلامی اصولوں کی روشنی میں بحث ہونی چاہیے۔

بات کو اختصار میں رکھنے کے سبب، میں یہاں صرف مسئلے کے تعلیمی اور تربیتی اور صحت سے متعلقہ پہلو پر چند نکات رکھوں گا۔ یہ واضح رہے کہ بات پاکستان کے حوالے سے ایک ایسے ماحول میں ہو رہی ہے جس میں ایک کم تر متوسط یا معاشی طور پر محدود آمدنی کا شخص اس پوری گفتگو کا مرکز ہے۔

ایک قیاسی مثال سے اس کی وضاحت شاید زیادہ بہتر ہو سکے۔ ۱۹۹۵ میں ایک شخص کی شادی ہوتی ہے، جب کہ اس کی تنخواہ صرف ۵ ہزار روپے ہے۔ وہ ۱۹۹۶ میں ایک بچی کا باپ بن جاتا ہے۔ اگر وہ بچے کی

جو حدیث عزل کرنے کا اختیار دیتی ہے' وہی اس بات کی دلیل بھی ہے کہ عام حالات میں ایسا نہ کرنا ہی مقصود و مطلوب شریعت ہے۔

کچھ حضرات تحدید نسل کی دلیل پر دور کی کوڑی عموماً جاپان سے لاتے ہیں اور وہاں کی معاشی ترقی اور اعلیٰ تعلیم کا سبب تحدید نسل کی پالیسی کو قرار دیتے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ وہ تصویر کے ایک رخ سے آگے بڑھ کر صورت حال کا مجموعی جائزہ بھی لیں اور خاص طور پر تازہ معاشی و معاشرتی جائزوں پر غور کریں تو شاید ان کی رائے میں توازن پیدا ہو سکے۔ تحدید نسل کے نتیجے میں ایک اہم معاشرتی اثر جو جاپان اور چین پر پڑ رہا ہے اس کا جائزہ ۲۱ نومبر ۱۹۹۸ کے اکنامسٹ میں لیا گیا ہے اور جاپان کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ ۲۰۲۰ میں ۱۶ فی صد آبادی کی اوسط عمر ۶۰ سال ہو گی اور ۲۰۳۰ تک دوسروں پر انحصار کرنے والے افراد کی شرح (dependency rate) ۷۴ فی صد ہو جائے گی۔ یہ وہ افراد ہوں گے جو اعلیٰ تعلیم و صحت اور دولت سے فیض یاب ہونے کے باوجود اس محبت' تعلق اور احترام سے محروم ہوں گے جو اولاد سے والدین کو' والدین سے اولاد کو ملتا ہے۔ اور یہ اپنے وجود کی بقا کے لیے ریاست کی سرپرستی کے محتاج ہوں گے۔

تحدید نسل بطور ریاستی پالیسی کے مغربی سامراج کی سازش ہو یا نہ ہو' قرآن و سنت کے مزاج و منشا سے بہرصورت متصادم ہے۔ انسانی فطرت سے بغاوت پر مبنی ایسی کسی بھی پالیسی کے نفاذ سے طاغوت اور شیطان کو خوش بھی ہونا چاہیے اور اس کی حمایت بھی کرنی چاہیے۔ امت مسلمہ کے مفاد کے منافی اس تحریک کو آپ اگر سازش قرار نہ بھی دیں تو کم از کم اس کے بارے میں یہ خیال بھی نہ کریں کہ وہ آپ کی خیر خواہی اور امت مسلمہ کو بام عروج پر پہنچانے کے لیے ہے (پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد)۔

کشمیر کے وفا شعار آپ کی توجہ چاہتے ہیں

کشمیر کے شہیدوں، مجاہدوں، زخمیوں اور اسیروں کی بے یار و مددگار مائیں، بہنیں، بچے اور وفا شعار مجاہد جو بھوک، بیماری، برف اور بارود کی بارش میں قابض بھارتی فوج سے لڑ رہے ہیں

وہ جو تکمیل پاکستان کے لیے
اپنی جانیں لٹا رہے ہیں
ان کے اجڑے گھروں کو بھی یاد رکھیں

کشمیر .... جہاں

۶۱۱۹۰ بچے، بوڑھے، خواتین اور جوان شہید ہوئے۔ ۸۶۳۲۷ زخمی ہوئے۔ ۷۵۶۶۱ عقوبت خانوں میں بند ہیں۔ ۵۷۶۵ نوجوان معذور ہیں۔ ۴۲۱۰۰ افراد ہجرت پر مجبور ہوئے۔ ۳۸۱۵۳ گھر اور اسکول جلا دیئے گئے۔ اور کنٹرول لائن پر حالیہ بھارتی گولہ باری سے ہزاروں خاندان بے گھر ہوئے۔

ان کے لیے اپنے نقد

عطیات **صدقات** **زکوٰۃ**

الگ الگ

چیک / ڈرافٹ بنام جناب عبدالرشید ترابی اکاؤنٹ نمبر 1797 بنوا کر درج ذیل پتہ پر ارسال کریں۔

اور اجناس (گرم کپڑے، کمبل، بستر اور راشن) جماعت اسلامی کے قریبی دفاتر میں جمع کرائیں یا براہ راست ذیل پتہ پر بھجوائیں

عبدالحلیم خان (مرکزی ناظم مالیات) جماعت اسلامی، آزاد جموں وکشمیر

415- پونچھ ہاؤس، صدر، راولپنڈی
فون : 511417 - 051
فیکس : 510197 - 051

یا

عیدگاہ روڈ، مظفر آباد، آزاد جموں وکشمیر
فون : 5482 , 4336 , 2334 - 0581
فیکس : 2580 - 0581

کتاب نما

کشمیر میں تحریک مزاحمت' ڈاکٹر طاہر امین۔ مترجم: عبداللطیف الفت۔ ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز' مرکز ایف سیون' اسلام آباد۔ صفحات: ۱۹۲۔ قیمت: درج نہیں [مع منتخب کتابیات: اردو' انگریزی]۔

اگرچہ ۱۹۴۷ سے ۱۹۴۹ تک' پھر ۱۹۶۵ میں اور اس کے بعد ۱۹۷۱ کے دوران مقبوضہ جموں و کشمیر میں حصول آزادی کے لیے مسلمانوں کی جہادی سرگرمیاں شروع ہو چکی تھیں مگر بعدازاں ان سرگرمیوں میں تسلسل اور تحرک قائم نہ رہا' البتہ اندر ہی اندر چنگاری سلگتی رہی۔ اب ۱۹۸۸ سے شروع ہونے والی تحریک حریت کشمیر نے عظمت جہاد' جاں بازی اور فدا کاری کی ایسی مثالیں قائم کی ہیں' جو تاریخ میں خال خال دکھائی دیتی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب کے مصنف پروفیسر طاہر امین ان دنوں کیمبرج یونی ورسٹی میں "اقبال چیر فار اسلامک اسٹڈیز" پر فائز ہیں۔ موصوف عالمی امور پر نظر رکھنے والے ایک ممتاز محقق اور بالغ نظر تجزیہ نگار ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے اختصار اور جامعیت کے ساتھ' موجودہ تحریک جہاد کشمیر کے آغاز' اس کے ارتقا' اور مستقبل کے امکانات پر بحث کی ہے۔

آج جب کہ امریکہ اور عالمی سطح پر اس کے حلیف طفیلی ادارے اہل کشمیر کی قسمت کو اپنی من مانی کی بھینٹ چڑھانے پر تلے دکھائی دیتے ہیں' زیر نظر کتاب میں اٹھائے گئے نکات گہرے غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ جن لوگوں کو حوادث زمانہ نے پاکستان کی قسمت کا امین بنا دیا ہے' انھیں چاہیے کہ وہ فائل بردار ملازمین اور قلم بکف کالم نگاروں کی اڑائی ہوئی گرد اور عالمی محوری قوتوں کے کھودے ہوئے گڑھے میں گرنے یا منزل کھوٹی کرنے سے اجتناب کریں۔

کشمیر کی تحریک جہاد سے قلبی وابستگی رکھنے کے باوجود مصنف کا رویہ غیر جذباتی' معروضی اور حقیقت پسندانہ ہے۔ مجاہدین کی قابل تحسین کارروائیوں پر داد دینے اور ان کی لذت ایمانی پر اَش اَش کر اٹھنے کے ساتھ ساتھ ان کا قلم خود احتسابی کے منصب سے غافل نہیں رہا۔ مثال کے طور پر وہ لکھتے ہیں: "کشمیریوں کی مسلح جدوجہد کی توانائی اور گیرائی میں ہی کشمیر کے مسئلے کا حل پوشیدہ ہے..... جہادی سرگرمیوں کا جائزہ لے کر ان کی قوت اور کمزوریوں کا ادراک حاصل کرنا نہایت ضروری ہے' تاکہ مسئلے کے حل کے امکانات کا جائزہ لیا جا سکے" (ص ۱۱۵-۱۱۶)--- ان کے باہمی اختلافات' سیاسی اور فوجی حکمت عملی میں باہمی رابطے کا

فقدان وہ اسباب ہیں، جن کی بنا پر وہ بھارت کو اس حد تک زچ نہیں کر سکے کہ صورت حال اس کے قابو سے نکل جائے۔ اگر تحریک مزاحمت ان کمزوریوں پر قابو پا لے تو اس میں اتنا دم خم ہے کہ وہ کشمیر میں بھارت کا موجود رہنا اس کے لیے ایک مہنگا سودا بنا دے۔ .... [اور وہ] .... کشمیری عوام سے ان کی مرضی کے مطابق بات چیت کرنے پر مجبور ہو جائے"۔ (ص ۹۷-۹۸)۔

اختلاف کے اس تذکرے کا ایک پہلو وہ یہ بیان کرتے ہیں: "کشمیری تحریک مزاحمت [میں] لبریشن فرنٹ اور اس کے ساتھ چند چھوٹی چھوٹی تنظیمیں یہ چاہتی ہیں کہ استصواب میں کشمیر کو آزاد رکھنے کا متبادل راستہ بھی موجود ہونا چاہیے۔ [جماعت اسلامی اور اسلامی جمعیت طلبہ کی حلیف] حزب المجاہدین اور اس طرح کی تنظیمیں اس کے برعکس اقوام متحدہ کی قراردادوں پر جوں کا توں عمل چاہتی ہیں، تاکہ پاکستان کے ساتھ الحاق کی راہ ہموار ہو سکے..... ان متضاد نقطہ ہاے نظر نے باہمی متصادم حکمت عملی کی راہ ہموار کی ہے، جس کا بھارت پورا فائدہ اٹھا رہا ہے ..... [ان] مزاحمتی گروپوں کے درمیان اختلاف ان کی فوجی کامیابیوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے" (ص ۱۵۰-۱۵۱)۔

اسی طرح انھوں نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ: "بھارتی دعووں کے برعکس تحریک [جہاد کشمیر] کے ابھرنے کے سلسلے میں [حکومت] پاکستان کا عمل دخل محض سطحی ہے..... [اس حوالے سے] بھارتی خفیہ ایجنسیوں نے (حکومت) پاکستان کو ذرا زیادہ ہی خراج تحسین پیش کر دیا ہے..... حقیقت یہ ہے کہ [گذشتہ دس برسوں کے دوران] پاکستان کی مختلف حکومتیں کشمیری مزاحمت کی حمایت سے جھجکتی رہی ہیں۔ اس تحریک کو موثر حمایت ملی ہے تو وہ صرف پاکستانی عوام کی طرف سے ملی ہے۔ پاکستانی رائے عامہ نے ہی مختلف حکومتوں کو مجبور کیا کہ وہ کشمیر کے مسئلے پر کوئی سمجھوتہ نہ کریں" (ص ۱۸۲-۱۸۳)۔

کتاب کے پیش لفظ میں مدیر ترجمان القرآن پروفیسر خورشید احمد نے بجا طور پر لکھا ہے کہ: مصنف کا سرچشمہ ان کی گہری بصیرت ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کرسی نشین اسکالروں، جذباتی طور پر غیر متعلق محققوں، نیز معمول کی کارروائی میں غرق بیورو کریٹس کی آرا کو نظرانداز کیا ہے۔ ان کی تحقیق کی بنیاد افغانستان اور کشمیر کے حالات کے گہرے شعور، بھارت کے موقف کے مختلف پہلوؤں کے محتاط نفسیاتی تجزیے اور تحریک مزاحمت کے جذبوں سے ہمدردانہ ہم آہنگی پر رکھی گئی ہے" (ص ۱۴)۔

اصل کتاب انگریزی میں ہے۔ جناب عبداللطیف الفت نے بڑی محنت سے رواں دواں ترجمہ کر کے کتاب کی ابلاغی سطح کو موثر انداز میں نمایاں کیا ہے (سلیم منصور خالد)۔

قرطاس اقبال' پروفیسر محمد منور۔ ناشر: اقبال اکادمی پاکستان' چھٹی منزل' ایوان اقبال' لاہور۔ صفحات: ۳۲۸۔ قیمت: ۱۷۵ روپے۔

پروفیسر محمد منور صاحب کی شخصیت اہل پاکستان خصوصاً علمی و ادبی اور صحافتی و اقبالی حلقوں کے لیے محتاج تعارف نہیں۔ بنیادی طور پر وہ ایک معلم رہے ہیں' اس کے ساتھ وہ ایک ادیب' شاعر' مقرر اور ان حیثیتوں سے بھی بڑھ کر ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والے' محب وطن پاکستانی ہیں۔ ان کی زندگی بھر کی سرگرمیاں ملت کی سربلندی و سرفرازی کی تمنا پر مرکوز رہی ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر علامہ اقبال' قائداعظم اور پاکستان سے متعلق موضوعات ہی پر قلم اٹھایا ہے۔ دو قومی نظریے کی صداقت' بھارت کے برہمنی چہرے' قائداعظم کی منفرد قیادت اور علامہ اقبال کی نابغہ روزگار شخصیت پر ان کے سیکڑوں مضامین اور متعدد کتابیں منظرعام پر آچکی ہیں۔ زیر نظر کتاب اس سلسلے کی تازہ کڑی ہے۔

قرطاس اقبال میں چند ایک مقالے تحقیقی و تنقیدی اور عالمانہ نوعیت کے ہیں' جیسے: اقبال بہ حضور آدم' یا علامہ اقبال اور اصول حرکت' یا علامہ اقبال اور آدم کی خود گریزی' مگر بیشتر مضامین اقبالیات کے عمومی موضوعات پر ہیں۔ یہ مختصر ہیں اور زیادہ تر ان کے مخاطب نوجوانان پاکستان ہیں۔ ان کا محرک نژاد نو کے لیے سوز و دردمندی اور راہنمائی کا جذبہ ہے۔ یہ مضامین' فکر اقبال کی نہایت عمدہ ترجمانی اور توضیح کے ساتھ قاری کا تعلق زندگی کے حیات افروز پہلوؤں اور زندہ مسائل سے جوڑتے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے ہدایت الٰہی کی صداقت و حقانیت' محبت رسولؐ' ختم نبوت' اسباب زوال امت' برعظیم ہندو پاکستان کا مسلم معاشرہ' ہندو ذہنیت' مطالبہ پاکستان کے محرکات' حصول پاکستان کے مراحل' اپنوں کی منافقت و غداری' غیروں کی سازشیں' سیاست دانوں کی ہوس پرستی اور دانش وروں کی کم عقلی وغیرہ پر کلام کیا ہے۔ ایک ایسے ماحول میں' جہاں چاروں طرف نفس پرستی' فتنہ انگیزی' تفرقہ پروری اور یاس انگیز قوتوں کا غلبہ ہے' ان مضامین کو پڑھتے ہوئے قاری کو ایک حوصلہ ملتا ہے اور وہ عزم و یقین اور ایک باطنی حرارت سے مالا مال و سرشار ہوتا ہے۔

پروفیسر محمد منور صاحب نے اس بات پر زور دیا ہے کہ علامہ اقبال' بدترین حالات میں بھی کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: میں نے بعض عزیزوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ حضرت علامہ آج زندہ ہوتے تو پاکستان کو چھوڑ کر بھاگ جاتے' کوئی پوچھے' کہاں بھاگ جاتے؟ وہ تو عالم اسلامی کی مکمل غلامی کا منظر دیکھ کر بھی مایوس نہ ہوئے:

کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھے

پروفیسر موصوف' افراد امت کی تمام تر کوتاہیوں اور بداعمالیوں کے باوجود' امت کے روشن مستقبل کے بارے میں پرامید ہیں۔ ان کے یہ قول: "اس وقت ہم مسلمان' حالت جنگ میں ہیں۔ دنیا بھر میں ہمیں' علامہ اقبال کے نغمہ ہاے پربہار کی ضرورت ہے"۔

زیر نظر مجموعہ مضامین مایوس دلوں میں امید اور روشنی کی جوت جگانے کی ایک قابل تحسین کوشش ہے' اور ذخیرۂ اقبالیات میں ایک بامعنی اضافہ (رفیع الدین ہاشمی)۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے دیس میں' حافظ محمد ادریس' ناشر: مکتبہ احیاے دین' منصورہ' لاہور۔ صفحات: ۲۳۳۔ قیمت: ۸۰ روپے۔

دعوت دین کے سلسلے میں' منصبی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے ساتھ ساتھ' حافظ محمد ادریس صاحب کا قلم بھی رواں دواں رہتا ہے۔ وہ اب تک پندرہ کتابیں تصنیف و تالیف اور ترجمہ کر چکے ہیں۔

انھوں نے دنیا کے دسیوں ممالک کا سفر کیا ہے۔ وہ اپنی سیاحت کی روداد پر مشتمل اکا دکا مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں' لیکن کتابی صورت میں ان کے کسی سفر کے حالات' پہلی بار مرتب ہو کر سامنے آرہے ہیں۔ شاید اس کا سبب یہ بھی ہے کہ زیر نظر سفرنامہ افریقہ سے متعلق ہے جہاں مصنف موصوف ایک طویل عرصے تک دعوت دین کے سلسلے میں مقیم اور مصروف رہے۔ ۱۹۹۷ کے اوائل میں جنوبی افریقہ کے اطبا کے اجتماع میں شرکت اس سفر کا محرک بنی۔ تقریباً ساڑھے تین ہفتوں میں حافظ صاحب نے کینیا' یوگنڈا اور جنوبی افریقہ کا ایک طویل دورہ کیا۔ احباب سے ہونے والی ملاقاتوں' اجتماعات میں خطابات' دعوتوں اور سیر و سیاحت کے احوال پر مبنی یہ روداد "ایشیا" میں قسط وار شائع ہوتی رہی۔ اب یہ کتابی شکل میں سامنے آئی ہے' جسے ایک غیر روایتی سفرنامہ قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید نے لکھا ہے کہ: "یہ حقیقت اور صداقت کا دل کش امتزاج ہے جو دل نشیں' نظر افروز اور روح افزا ہے"۔

چونکہ حافظ صاحب افسانہ نگار بھی ہیں اس لیے ان کا اسلوب بہت رواں اور دل نشیں ہے۔ ضمنی عنوانات نے تنوع پیدا کر دیا ہے۔ سفرنامے میں حافظ صاحب اپنے قیام افریقہ کی یادوں کو تازہ کرتے ہیں۔ احباب کا ذکر ہے' دعوتی اور تحریکی سرگرمیوں کی تفصیل ہے اور مسائل و مشکلات اور پھر کامیابی کے امکانات کا تذکرہ ہے۔ مسافر اپنے گردوپیش کی فضا' ماحول اور تاریخ و جغرافیے کا ذکر بھی کرتا ہے۔ یہ تنوع قاری کو برابر اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔ حافظ صاحب نے سفرنامے میں زیادہ تر ڈائری کی تکنیک اختیار کی ہے' جو سفرنامے کا ایک مقبول انداز ہے۔ وضاحت کے لیے جنوبی' شمالی اور وسطی افریقہ کے نقشے بھی دیے گئے ہیں مگر ان میں ملکوں اور شہروں کے نام انگریزی میں ہیں' اردو میں ہوتے تو بہتر تھا۔

بہ حیثیت مجموعی یہ ایک ایسا بھرپور اور معلومات افزا سفرنامہ ہے جسے قارئین افسانے کی طرح دلچسپ پائیں گے (رفیع الدین ہاشمی)۔

جدید تحریک نسواں اور اسلام' ثریا بتول علوی۔ ناشر: ادارہ مطبوعات خواتین' ۴۲۔ چیمبرلین روڈ' لاہور۔ صفحات: ۴۵۶۔ قیمت: ۱۸۰ روپے۔

روئے زمین پر سانس لینے والوں میں کم از کم ہر پانچواں ذی روح مسلمان ہے اور اس لحاظ سے ہر دسویں عورت مسلمان ٹھہرے گی۔ مسلمان عورت کو اسلام نے وہ مرتبہ و مقام اور وہ رتبہ عطا کیا ہے جو آج تک کسی اور دین نے اس کو نہیں دیا۔ خواتین کے حقوق کی فہرست انھیں تفویض کردہ فرائض سے کہیں زیادہ طویل ہے مگر بیشتر مسلم خواتین کو اپنی کم علمی یا لاعلمی کی وجہ سے نہ ان حقوق کا شعور ہے اور نہ اپنے بلند مقام کا ادراک۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظریں' مغرب کی ظاہری چکاچوند والی آزادی' نام نہاد مساوات مرد و زن اور اس سے جنم لینے والی بہ ظاہر کامیاب زندگی میں الجھ جاتی ہیں۔ دور حاضر میں ان کو ورغلانے کے لیے طرح طرح کے پر فریب اور سہانے نعروں کی آڑ لے کر بہت سے افراد اور ادارے بھی اپنا شرانگیز کردار ادا کر رہے ہیں۔

اس آلودہ ماحول میں ایسے صالح لٹریچر کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے جس میں مسلمان خواتین کو اسلامی معاشرے میں ان کے مقام و مرتبے' آزادی کی حدود اور ان کے حقوق و فرائض سے جامع اور مدلل انداز میں آگاہ کیا گیا ہو۔ چند سال پہلے ثریا بتول علوی کی ایک معرکہ آرا تصنیف "**اسلام میں عورت کا مقام و مرتبہ**" منظرعام پر آئی تھی۔ اب زیر نظر کاوش میں انھوں نے جدید تحریک نسواں کے مختلف پہلوؤں کو انتہائی جامع' مدلل اور بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔ آزادی نسواں کے حوالے سے متجددین اور اسلام دونوں پہلوؤں سے گفتگو کی ہے۔ اسلام کی ہدایت کی روشنی میں وہ تمام پہلو زیر بحث آئے ہیں جو مغرب کے ناقدین اور ملک کے سیکولر اور لبرل حلقے کی نظر میں قابل اعتراض قرار پاتے ہیں' پھر ان کے بھرپور اور جامع جوابات دیے گئے ہیں۔

ثریا علوی صاحبہ نے زیر نظر کتاب میں نہ صرف ستر و حجاب' نکاح' طلاق' مہر' خلع' تعدد ازواج اور عورت کی سربراہی وغیرہ جیسے مسائل پر قرآن و حدیث کی روشنی میں سیر حاصل بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے امت مسلمہ کے لیے جو لائحہ عمل متعین فرمایا ہے وہ ہر اعتبار سے امت کے لیے نفع مند ہے' بلکہ دیت' شہادت' وراثت اور ولایت جیسے اہم اور نازک مسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مصنفہ نے موجودہ حالات پر ان کو عمدگی سے منطبق بھی کیا ہے۔

کتاب' مجموعی طور پر اسلامی نقطہ نظر سے ایک متوازن فریم ورک میں لکھی گئی ہے۔ اس کے ابواب' فہرست' مضامین اور عنوانات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے اس کی جامعیت اور افادیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ آغاز میں جدید نسوانی تحریکوں کا مغرب میں اور مسلمان ممالک میں مرحلہ وار ارتقا بیان کیا گیا ہے۔ بعدازاں مرد و زن کے درمیان مساوات کے موضوع پر مغربی تہذیب اور اسلامی احکام کا تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مشہور زمانہ اسلام دشمن خواتین کانفرنسوں کا احوال' خواتین انکوائری کمیشن کی شرمناک سفارشات' اہل مغرب کی معاشرتی و اخلاقی تباہی اور پھر مصنفہ کے اپنے مشاہدات' تاثرات اور جذبات کا تذکرہ معلومات افزا بھی ہے اور عبرت انگیز بھی۔ تحریر کی روانی' دردمندی اور اثر انگیزی پڑھنے والے کے ذہن پر ایک گہرا تاثر چھوڑتی ہے۔ آخری باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ اب خود مغرب کے سنجیدہ دانشور اور پڑھے لکھے طبقے اسلام کی پرحکمت متوازن اور قابل عمل تعلیم کی حقانیت کے معترف ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں جن میں خواتین کی تعداد زیادہ ہے۔ کتاب کے آخر میں چند اولوالعزم خواتین کے ایمان افروز تذکرے بھی شامل کیے گئے ہیں جس سے عورت کو اسلام کے عطا کردہ حقوق و فرائض کی افادیت واضح ہو جاتی ہے۔

اس کتاب کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اسلامی احکامات کے مطابق عورتوں کا مقام و مرتبہ' ان کی آزادی کی حدود و قیود' حقوق و فرائض اور تمام مسائل سے متعلق مکمل تعلیمات ہمیں اس کتاب سے حاصل ہو جاتی ہیں۔ مولفہ کا طرز نگارش پراثر اور عام فہم ہے۔ کہیں کہیں جذبات حاوی ہوتے نظر آتے ہیں جس سے تحریر کا توازن متاثر ہوتا ہے لیکن مسلمان خواتین کے لیے مصنفہ کا بے پایاں خلوص اور امت کے لیے خیرخواہی کا جذبہ قابل قدر ہے (ربیعہ رحمان)۔

مطبوعات موصولہ

☆ تحریک پاکستان اور بلوچستان' پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر۔ ناشر: بولان بک کارپوریشن' زمانہ سٹریٹ' سرکی روڈ' کوئٹہ۔ صفحات: ۱۸۸۔ قیمت: ۱۲۰ روپے۔ [ایسی کتابوں کی توضیحی فہرست جن میں تحریک پاکستان کے ضمن میں بلوچستان کا ذکر ہے۔ اس موضوع پر بعض لکھنے والوں کا مختصر تعارف اور ان کے مضامین کی فہرست۔ اپنے موضوع پر ایک مفید ماخذ]۔

☆ ادا جعفری' فن اور شخصیت' مرتبہ: ڈاکٹر فرمان فتح پوری' امراؤ طارق۔ ناشر: حلقہ نیاز و نگار' کراچی۔ صفحات: ۳۹۱۔ قیمت: ۲۵۰ روپے۔ [معروف شاعرہ ادا جعفری کی شخصیت و شاعری اور ان کی خود نوشت پر برعظیم کے ۲۵ معروف ادیبوں اور ناقدوں کے مضامین اور تاثرات کا مجموعہ]۔

مدیر کے نام

محمد شکیل' ٹوبہ ٹیک سنگھ

"مسجد اقصیٰ کی شہادت کا منصوبہ" (مارچ ۹۹) نظر سے گزرا تو کتنے خونی مناظر نظروں کے سامنے پھر گئے جن کا تعلق ماضی سے بھی ہے اور مستقبل سے بھی۔ سوچتا ہوں' ابھی کیسی کیسی قیامتیں ہماری منتظر ہیں۔ مسجد اقصیٰ کے بارے میں ذہن میں طرح طرح کے سوال اٹھتے ہیں۔ مثلاً بیت المقدس' صخرہ' ہیکل سلیمانی اور مسجد عمر' مسجد اقصیٰ کا حصہ ہیں' یا الگ الگ ہیں؟ تحقیقی مضمون کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

محمد اسلم ہاشمی' کراچی

"صاحب کی امامت" (مارچ ۹۹) تو جیسے دورہ واجپائی کے لیے ہی لکھی گئی تحریر تھی! خودکشی کے بارے میں آپ کے مضمون نے عوام کو صراط مستقیم دکھائی ہے۔ کاش حکومت بھی اپنے فرض کو پہچانے اور اسلام جیسے مکمل نظام حیات کے حامل ہوتے ہوئے' معاشرے میں بگاڑ کے اسباب دور کرنا اپنی ذمہ داری تصور کرے۔

رفیع الدین ہاشمی' لاہور

ڈاکٹر محبوب الحق مرحوم کا تذکرہ' ترجمان القرآن میں ممنوع کیوں؟ ("مدیر کے نام" مارچ ۹۹)۔ موضوع یا شخصیت کوئی بھی ہو' اصل چیز ہے مضمون کا معیار اور مضمون نگار کا زاویہ نظر۔ متذکرہ مضمون سے پیدا ہونے والے تاثر اور ترجمان القرآن کے مقاصد میں کوئی مغائرت نہیں۔ اور مضمون نگار نے محبوب الحق کی کمزوریوں اور ان کی فکری لغزشوں سے صرف نظر نہیں کیا۔

مولانا گوہر رحمٰن' مردان

میرے مضمون "امام ابوحنیفہ کے فقہی اصول" (فروری ۹۹) میں چار کتابت کی غلطیاں ہو گئی ہیں جن کی اصلاح ضروری ہے۔ ۱۔ ص ۳۰ سطر ۱۱ پر لکھا گیا ہے کہ "مسلم الثبوت کے مصنف محب اللہ بہاری (ف ۱۱۹ھ) نے بزدوی کا دفاع کرتے ہوئے لکھا ہے"۔ اصل عبارت اس طرح ہے: "مسلم الثبوت کے مصنف محب اللہ بہاری (ف ۱۱۱۹ھ) نے اعتراض کیا تھا کہ علم و فقہ کی تعریف میں عمل کو کس طرح داخل کیا جا سکتا ہے؟ مگر مسلم الثبوت کے شارح مولانا عبدالعلی بحرالعلوم نے بزدوی کا دفاع کرتے ہوئے لکھا ہے"۔ ۲۔ محب اللہ بہاری کا سنہ وفات ۱۱۹ھ لکھا گیا ہے' صحیح ۱۱۱۹ھ ہے۔ ۳۔ ص ۳۷ سطر ۸ پر لکھا گیا ہے کہ "قرآن کریم تمام اصول و ماخذ کا اصل الاصل اور مصدر المصادر ہے"۔ اصل عبارت یہ ہے: "قرآن کریم تمام اصول و مآخذ کا اصل الاصول اور مصدر المصادر ہے"۔ ۴۔ ص ۳۹ سطر ۱۵ پر تحریر ہو گیا ہے کہ "امام عبدالعزیز بخاری (ف ۷۳۰ھ) اصول بزدوی میں لکھتے ہیں" حالانکہ اصل عبارت اس طرح ہے: "امام عبدالعزیز بخاری (ف ۷۳۰ھ) اصول بزدوی کی شرح میں لکھتے ہیں"۔

محمد سعید' کبل' سوات

"عراق پر امریکی حملے" (فروری ۹۹) نے ذہن میں کھٹکنے والے کئی سوالات حل کر دیے۔ یہ تحریر بہت پہلے آنا چاہیے تھی' بہرحال دیر آید' درست آید۔ "رسائل و مسائل" میں مسائل زیادہ اور جواب مختصر ہوں تو قارئین کے لیے زیادہ دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

عرفان احمد' منچن آباد

"اسلامی تحریکوں کا نظام تربیت" (دسمبر ۹۸' جنوری ۹۹) ایک مفصل مقالہ تھا۔ کسی بھی نظام کو جانچنے کے لیے ہمیں معاشرے اور تحریک پر اس کے اثرات کا' عصر حاضر کے تناظر میں جائزہ لینا چاہیے۔ تہذیب مغرب کا سب سے بڑا فتنہ معیار زندگی کا جھوٹا تصور ہے جس کے پیچھے سب پروانہ وار لپکتے جا رہے ہیں۔ تربیت کا وہ نظام کامیاب ہے جو اس بے روح معاشرے کے افراد میں آخرت کی فکر' جنت کی تڑپ اور آگ سے بچنے کی ایسی آرزو پیدا کر دے' جو دنیا کو ٹھکرا دینے کی قوت پیدا کرے۔

کشمیر کے وفا شعار آپ کی توجہ چاہتے ہیں

کشمیر کے شہیدوں‘ مجاہدوں‘ زخمیوں اور اسیروں
کی بے یار و مددگار مائیں‘ بہنیں‘ بچے اور وفا شعار مجاہد
جو بھوک‘ بیماری‘ برف اور بارود کی بارش میں
قابض بھارتی فوج سے لڑ رہے ہیں

وہ جو تکمیل پاکستان کے لیے
اپنی جانیں لٹا رہے ہیں
ان کے اجڑے گھروں کو بھی یاد رکھیں

کشمیر .... جہاں

۶۱۱۹۰ بچے‘ بوڑھے‘ خواتین اور جوان شہید ہوئے۔ ۸۶۳۲۷ زخمی ہوئے۔ ۵۶۶۱۷ عقوبت خانوں میں بند ہیں۔ ۶۵۷۵ نوجوان معذور ہیں۔ ۴۲۱۰۰ افراد ہجرت پر مجبور ہوئے۔ ۳۸۱۵۳ گھر اور اسکول جلا دیئے گئے۔ اور کنٹرول لائن پر حالیہ بھارتی گولہ باری سے ہزاروں خاندان بے گھر ہوئے۔

ان کے لیے اپنے نقد

عطیات **صدقات** **زکوٰۃ**

الگ الگ

چیک / ڈرافٹ بنام جناب عبدالرشید ترابی اکاؤنٹ نمبر 1797 بنوا کر درج ذیل پتہ پر ارسال کریں۔
اور اجناس (گرم کپڑے‘ کمبل‘ بستر اور راشن) جماعت اسلامی کے قریبی دفاتر میں جمع کرائیں یا براہ راست ذیل پتہ پر بھجوائیں

عبدالحلیم خان (مرکزی ناظم مالیات) جماعت اسلامی‘ آزاد جموں و کشمیر

415- پونچھ ہاؤس‘ صدر‘ راولپنڈی
فون : 051 - 511417
فیکس : 051 - 510197

یا

عیدگاہ روڈ‘ مظفر آباد‘ آزاد جموں و کشمیر
فون : 0581 - 2334 , 4336 , 5482
فیکس : 0581 - 2580

حضرت عمرو بن عبسہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :
بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب رات کے وقت ہوتا ہے۔ پس اگر
تم سے ہو سکے کہ رات کے وقت میں اللہ کو یاد کرنے والے ہو تو ضرور ہو۔ (ترمذی)

ق، مودودی نے ملکؔ عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر د۔اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور سے شائع کیا

زخمی، معذور اور بیمار مجاہدین، مہاجرین کا ادارہ

آئیے!
ان زخموں پر مرہم رکھنے میں
ہمارا ساتھ دیجئے





آپ کا تعاون کسی زخمی مجاہد کو
صحت دینے کا سبب بنے ....!
اور آپ کیا چاہتے ہیں ....؟

کشمیر سرجیکل ہسپتال

زیر اہتمام: پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن

اکتوبر 1990 سے مجاہدین اور مہاجرین کو مفت طبی امداد فراہم کر رہے ہے۔

اکتوبر 1990 سے جون 1998 تک 2 لاکھ 85 ہزار مریضوں کا علاج کیا گیا۔

22500 سے زائد مریض مختلف ہسپتالوں کو ریفر کیے گئے۔

1000 سے زائد افراد کو فراسٹ بائٹ سے نجات دلا کر معذور ہونے سے بچا لیا گیا۔

تمام تنظیموں کے مجاہدین کیلئے فرسٹ ایڈ مہیا کی جا رہی ہے۔

جہاں ہر روز 150 سے 250 تک مریضوں کو مفت طبی امداد فراہم کی جاتی ہے۔

ہسپتال کے زیر اہتمام چار مستقل ڈسپنسریاں اور دو ایمبولینس گاڑیاں ہمہ وقت مصروف کار ہیں۔

کشمیر سرجیکل ہسپتال کے تحت فرسٹ ایڈ سنٹر کام کر رہے ہیں۔

معذور مجاہدین اور مہاجرین کو 800 سے زائد مصنوعی اعضا لگائے گئے۔

دو نئے وارڈز کی تعمیر کی جا رہی ہے جبکہ کیمپوں میں چار نئی ڈسپنسریاں قائم کی جا رہی ہیں۔

کیا آپ کا بھی اس میں کوئی حصہ ہے؟

خوش نصیب ہے
جو گھر بیٹھے...

- غزوہ ہند میں شریک ہے۔
- اپنی ملت کی زخمی شہ رگ سے بہتے لہو پر مرہم رکھ رہا ہے۔
- زخمی و معذور مجاہدین و مہاجرین کی خدمت و عبادت کا ثواب لے رہا ہے۔
- عظیم ملی فریضہ کی ادائیگی کر رہا ہے۔

کشمیر سرجیکل ہسپتال سے تعاون کیجئے

آپ نقد عطیات کے علاوہ ادویات کی صورت میں بھی مدد کر سکتے ہیں

ڈاکٹر محمود حسین کیانی (میڈیکل سپرنٹنڈنٹ)

کشمیر سرجیکل ہسپتال، پولٹری فارم روڈ، مظفر آباد، آزاد جموں و کشمیر۔ فون: 0581-3700

اکاؤنٹ نمبر: 1-1128 حبیب بینک لمیٹڈ، چھلہ بانڈی مظفر آباد۔